

حیات سعدی

خواجہ الطاف حسین حالی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066
بہ اشتراک
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

Hayat-e-Saadi

By

Khuwaja Altaf Husain Hali

© قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2004، شکر 1924

قومی اردو کونسل کا پہلا ایڈیشن : 1100

قیمت : 96/-

سلسلہ مطبوعات : 1173

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی 66
طابع: لاہوری پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اس نے مختلف اقدام کیے ہیں جن میں کمپیوٹر انیلیکیشن، ملٹی ٹکول ڈی۔ٹی۔پی۔، کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن اور اردو رسم الخط میں سریفیکٹ کورس شامل ہیں۔ ان اقدامات کے ذریعے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اردو تعلیم کے منظر نامے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کوشش کو بڑی حد تک کامیابی بھی ملی ہے۔

قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابوں کی طباعت اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اس لیے اردو زبان کا وہ کلاسیکی سرمایہ جو دھیرے دھیرے نایاب ہوتا جا رہا ہے، قومی اردو کونسل نے اس کی مکرر اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے کارہائے نمایاں میں سے ایک اہم کام ان اردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کی اشاعت ہے جن کا شمار اردو کے کلاسیکی سرمائے میں ہوتا ہے۔ ان کتب کی اردو شائقین کے حلقوں میں جس قدر پذیرائی ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لیے اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی تمام مطبوعات کو ان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل ایک مشترکہ معاہدے کے تحت ازسرنو شائع کرے گی۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر

حیاتِ سعدی

فہرست

صفحہ	نمبر شمار	صفحہ	نمبر شمار
71	گلستان اور خارستان کا مقابلہ	5	1- دیباچہ
74	گلستان اور پریشان کا مقابلہ	9	2- پہلا باب (شیخ کی سوانح عمری)
122	غزلیات شیخ	9	فارس اور شیراز کا حال
140	قصائد وغیرہ	12	شیخ کا نام، نسب، ولادت اور بچپن
147	مدح و موعظہ، مجدد الدین رومی	13	شیخ کی تعلیم کا حال
150	صاحبیہ	24	شیخ کی سیاحت کا حال
154	رباعیات	30	شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا
161	مفردات		
164	مطابحات و ہزلیات و مضحکات	45	3- دوسرا باب (شیخ کی تصنیفات)
168	عربی قصائد اور مقطعات	45	شیخ کی شاعری کی شہرت اُس کی
175	4- خاتمہ		زندگی میں
	شیخ کے عام حالات اور اس کی عام	48	شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں
	شاعری پر اجمالی نظر	53	کلیاتِ شیخ
		54	گلستان اور بوستان
		67	گلستان اور بہارستان کا مقابلہ

دیباچہ

مشہور آدمیوں کا حال لکھنا جس کو یونانی میں بیوگرافی اور عربی میں ترجمہ یا تذکرہ کہتے ہیں کم و بیش قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اگرچہ اُس وقت زیادہ تر بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے لوگوں کو اکثر زبانی یاد ہوتے تھے جو مناسب موقعوں پر بیان کیے جاتے تھے۔ لیکن یہودیوں کے ہاں قدما کی سرگزشتیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ یہودیوں کے بعد یونانیوں اور رومیوں نے اِس طرف توجہ کی۔ چنانچہ یونان کے مشہور بیوگرافر پلوٹارک کی بیوگرافی جو دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی اُس عہد کے تذکروں میں ممتاز اور برگزیدہ ہے۔ اور عیسائیوں کے مذہبی لڑچکر میں اُس زمانے کے اولیاء، شہدا اور مجتہدوں کی سوانح عمری جو کسی قدر مکمل ہیں کثرت سے موجود ہیں۔ زمانہ متوسط میں مسلمانوں کی بیوگرافی سب سے زیادہ وقعت کے قابل ہے۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں تذکرہ لکھنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے حالات محض بطور روایت کے بیان کرتے تھے درایت کو اس میں کچھ دخل نہ دیتے تھے اور بیان میں مبالغہ کو زیادہ کام میں لاتے تھے۔ مسلمانوں کی بیوگرافی میں بھی یہی عام خاصیت پائی جاتی ہے۔ صرف رجال حدیث کے حالات جو محدثین نے لکھے ہیں اُن میں البتہ بہت احتیاط کی گئی ہے ہر ایک شخص کے اخلاق اور خصائل راست راست بے کم و کاست لکھے گئے ہیں اور ان کے عیب اور خوبیاں پوست کندہ بیان کی گئی ہیں۔ باقی علماء اور شعرا وغیرہ کے تذکرے اکثر ایسے نہیں ہیں۔ اور چونکہ تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل اور روایت پر تھا اس لیے اُن لوگوں کے سوا جن کے حالات تاریخ میں مفصل لکھے گئے ہیں جیسے (خلفاء، سلاطین، وزرا اور سپہ سالار وغیرہ) باقی تمام اہل کمال کے حالات مختصر طور پر تحریر ہوئے ہیں۔ اور مشہور سے مشہور مصنف کی لائف بھی جداگانہ نہیں لکھی گئی۔ زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترہویں صدی سے بیوگرافی کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ یہاں تک کہ

تاریخ کی طرح بیوگرافی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے۔ حال کی بیوگرافی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں۔ مصنف کے کلام پر خوض کیا جاتا ہے اور اُس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔

بیوگرافی اُن بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنہوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلانی ہیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں اُن کے لیے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے جو اُن کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور اُن کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو اُن کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال اُن کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات صرف کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچایا تھا چنانچہ لکھا ہے کہ لوتھر¹ کے دل میں جو ایک غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی اور بنجمن² فرینکلن نے نہایت پست حالت سے اعلیٰ درجہ تک ترقی اور شہرت حاصل کی اُس کا بڑا سبب یہی بیوگرافی کا مطالعہ تھا۔ بیوگرافی علم اخلاق کی نسبت ایک اعتبار سے زیادہ سودمند ہے۔ کیونکہ علم اخلاق سے صرف نیکی اور بدی کی ماہیت معلوم ہوتی ہے اور بیوگرافی سے اکثر نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلاف کے ستودہ کاموں کی ریس کرنے کا شوق دامن گیر ہوتا ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ ”بیوگرافی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل چلا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو“ ہمارے ملک میں بیوگرافی

1۔ لوتھر جرمنی کا رہنے والا عیسائی مذہب کا ایک مشہور مصلح اور تمام یورپ کو پوپ کے بچے سے نجات دینے والا ہے 1483ء میں پیدا ہوا اور 1546ء میں فوت ہوا۔

2۔ یہ شخص امریکا کا ایک مشہور فاضل ہے جس نے سب سے اول علم برق کے اصول دریافت کیے ہیں 1706ء میں بمقام بوٹن پیدا ہوا اور 1790ء میں فوت ہوا۔

کی طرف اب تک کچھ توجہ نہیں ہوئی۔ ملک کی عام زبان یعنی اُردو میں اب تک یا تو یورپ کے بعض مشہور لوگوں کے حالات انگریزی سے ترجمہ ہوئے ہیں یا ایسے لوگوں کے سوانح لکھے گئے ہیں۔ جن کے حالات پڑھ کر کوئی عمدہ تحریک دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کے اکابر و اسلاف میں بھی ایسے بہت سے افراد نکلیں گے جن کے بڑے بڑے کام اور اُن کے کمالات قوم کے لیے سرمایہ افتخار ہیں اور موجودہ نسلوں کا فرض ہے کہ اُن کا نام زندہ کرنے اور آئندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لیے اُن کے فضائل اور کمالات دنیا میں شائع کریں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ قدما میں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں اُن کے بھی مفصل حالات دستیاب ہونے سخت دشوار بلکہ ناممکن ہیں صرف تذکروں میں کچھ کچھ مختصر حال درج ہے لیکن اُس سے کسی کی لائف ترتیب وار لکھنی ہرگز ممکن نہیں۔

ہم نے اس خیال سے کہ شیخ سعدی شیرازی کا نام حد سے زیادہ مشہور ہے شاید اُن کے مفصل حالات بہم پہنچ جائیں۔ اُن کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس غرض سے اکثر فارسی تذکرے جو یہاں مل سکتے ہیں دیکھے اور انگریزی تذکرہ سرگور اوہلی¹ صاحب کا بھی دیکھا مگر ان تمام تذکروں میں زیادہ تر وہی شیخ کی مشہور نقلیں اور حکایتیں جو زبان زد خاص و عام ہیں تھوڑے تھوڑے تفاوت کے ساتھ مندرج پائیں۔ شیخ کی تصنیفات پر بھی اجمالی تعریف کے سوا کسی نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے اُس کے کلام کی عظمت اور واقعی خوبیاں معلوم ہوں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں مایوس کرنے والی تھیں مگر ہم نے اپنے ارادہ کو جس طرح ہو سکا پورا کیا۔ جس قدر صحیح اور معقول باتیں تذکروں سے معلوم ہو سکتی تھیں اُن کے علاوہ بعض حالات خود شیخ کے کلام سے استنباط کیے۔ اور نیز اُس عہد کی تاریخ میں اکثر واقعات کا سراغ لگایا اور کچھ باتیں علی بن احمد جامع کلیات شیخ کے دیباچہ سے اخذ کیں۔ اور کچھ کچھ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی۔ اور اس تمام معلومات کو جہاں تک ممکن تھا لائف کی

1۔ یہ صاحب 1878ء میں جب کہ مارکوس آف وٹری صاحب گورنر جنرل تھے بطریق سیاحت ہندستان میں آئے تھے۔ شدہ شدہ لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے ہاں نوکر ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ کی طرف سے ایران میں سفیر ہو کر گئے۔ سفارت کے زمانے میں ایک تذکرہ ایران کے مشہور شاعروں کا جن میں شیخ بھی شامل ہے انھوں نے بہت کوششوں سے لکھا تھا۔

صورت میں مرتب کیا۔ اور شیخ کی تصنیفات کے بیان میں زیادہ تر اپنی ناچیز رائے اور تفصیل پر بھروسہ کر کے یہ مضمون ختم کیا گیا۔ اگرچہ شیخ کی اصل سرگزشت میں جس قدر کہ وہ اب تک معلوم ہوئی ہے، کوئی عظیم الشان واقعہ نہیں ہے لیکن جس ترتیب کے ساتھ اُس کے پراگندہ حال جمع کر کے اس کتاب میں لکھے گئے ہیں اور جس طریقہ سے اُس کی عمدہ تصنیفات اور پاکیزہ خیالات پر بحث کی گئی ہے اُس سے اُمید کی جاتی ہے کہ عام ناظرین کے لیے اس کا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ اور خاص کر شعر اکو اس سے کسی قدر بصیرت اور نصیحت بھی حاصل ہوگی۔

اس کتاب کے دو باب اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلے باب میں شیخ کی سوانح عمری کا بیان ہے اور دوسرے باب میں اُس کی تصنیفات کا مفصل ذکر ہے اور خاتمہ میں اُس کے عام حالات اور عام شاعری پر بالا جمال نظر کی گئی ہے۔ اگرچہ اسلام کے قدیم مصنفوں میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی عظمت اور جلالت کے سامنے شیخ کو کچھ رتبہ نہیں ہے مگر ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لیے لکھا ہے کہ ہندستان میں اُس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنف مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اُس کے رتبہ کو نہیں پہنچا۔ لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو ہمارا ارادہ ہے کہ اور بھی چند مشہور اور ذی وقعت مصنفوں کی سوانح عمری اور اُن کی تصنیفات کا بیان جدا جدا لکھیں گے۔

السَّمْعِيُّ مَنَى وَ الْاِتِّمَامُ مِنَ اللَّهِ

پہلا باب

شیخ کی سوانح عمری

شیخ کی سرگزشت بیان کرنے سے پہلے اُس مردم خیز خطہ کا مختصر حال لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا جس کی خاک سے ایسا مفید اور مقبول مصنف پیدا ہوا۔ اور جہاں سے علماء و شعرا اور جلیل القدر مصنفوں کی ایک جماعت کثیر عروج اسلام کے ہر طبقہ اور ہر صدی میں ظہور کرتی رہی ہے۔

فارس اور شیراز کا حال

ایران کے جنوب مغربی حصے میں خلیج فارس کے کنارہ پر پارس¹ ایک خطہ ہے جس کو عرب فارس کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے لیکن اب خاص اس حصے کو پارس کہا جاتا ہے۔ اس چھوٹی سی ولایت میں بہت سی قدرتی اور قدیم مصنوعی چیزیں ایسی ہیں کہ اُس کو دنیا کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

تقریباً آدھا ملک پہاڑی اور آدھا میدانی ہے۔ اور جنوبی حد پر سمندر یعنی خلیج فارس ہے آب و ہوا نہایت گرم ہے اور کہیں نہایت سرد ہے۔ اکثر صحرا سبز و شاداب ہیں۔ جا بجا چٹے اور ندیاں جاری ہیں۔ صحراے شاپور میں جو کہ شیراز کے فواح میں ہے ایک وسیع قطعہ ہے جس کا نام شعب بوآن ہے۔ عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں چار تفرج گاہیں ایسی

1۔ پارس جیسا کہ فرہنگ ناصری میں لکھا ہے ہوشنگ کے بیٹے کا نام تھا۔ اُسی کے نام سے قدیم زمانہ میں تمام ایران کو پارس کہتے تھے اور اہل یورپ اب بھی تمام ایران کو اسی لفظ پرشیا یعنی پارس کہتے ہیں لیکن جب سے کہ ایران کے ہر ایک صوبہ اور ولایت کا جدا جدا نام رکھا گیا اُس وقت سے پارس اس خاص ولایت کو کہنے لگے۔

ہیں جن کا نظیر نہیں۔ صفد سمرقند¹، غوطہ دمشق، نہر ابلہ اور شعب بوآن اتا یک ابو بکر بن سعد زنگی جس کے عہد حکومت میں شیخ نے گستاخ لکھی ہے ہمیشہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ میرے ملک میں دو چیزیں ایسی ہیں جو خوف اور اطمینان کی حالت میں بادشاہوں کے لیے ناگزیر ہیں۔ خوف کی حالت میں قلعہ سفید اور اطمینان کی حالت میں نزہت گاہ شعب بوآن۔ اکثر شعراے عرب نے اس قطعہ کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں جن میں سے سلامی شاعر کا قصیدہ جو عضد الدولہ دیلمی کی فرمائش سے لکھا گیا تھا بہت مشہور ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے۔

اذا اشرف المحزون من راس قلعة علی شعب بوآن استراح من الكرب
ترجمہ: جب غمگین آدمی قلعہ پر سے شعب بوآن کی فضا کو دیکھتا ہے تو اُس کی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں۔

فارس کے میوے عراق عجم میں جاتے ہیں۔ گرم پانی کے چشمے اور سفید کانیں فارس میں موجود ہیں۔ فارس کے آثار قدیمہ دنیا کے اُن عجائبات میں سے ہیں جن کو اگلے زمانہ کے لوگ جن اور پری کے کام سمجھتے تھے۔ جیسے تخت جشید، نقش شاپور، دھمہ فریدون اور خانہ زردشت ان کا مفصل حال ایران کی انگریزی تاریخوں میں مذکور ہے۔ انہی آثار قدیمہ کی نسبت عربی شیرازی نے کہا ہے:

از نقش و نگار در رود یوار شکستہ آثار پدید است ضا دید عجم را

اس کے سوا اور بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے انسان کے قویٰ میں فتنگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر مردم خیز سمجھے گئے ہیں۔ جیسے یزدیند، گازرون، فیروز آباد، بیضا، شیراز وغیرہ۔ ان شہروں میں کثرت سے علماء و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی تصنیفات مسلمانوں میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صد ہا سال ایران کا پائے تخت رہا ہے۔ مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قم کو دار المومنین اور یزد کو دار العباد کا خطاب دیا ہے اسی طرح شیراز کو دار العلم کے لقب سے ملقب

1۔ صفد محراب صفد وعب کی زمین اور صفد سمرقند ایک نزہت گاہ سمندر کے قریب تھی۔ غوطہ بھی شیب کی زمین کو کہتے ہیں۔ اور غوطہ دمشق کی ایک سیر گاہ دمشق میں تھی۔ ابلہ بھرہ میں ایک بڑا مقام تھا وہاں ایک ندی تھی اُس کو نہر ابلہ کہتے تھے۔ یہ تینوں مقام اور شعب بوآن دنیا کے چار بہشت سمجھے جاتے تھے۔

کیا ہے۔ اگرچہ شیراز کا علم و فضل زمانہ کے انقلاب اور سلطنت اسلامیہ کے تنزل سے اب نہایت پست حالت میں ہے لیکن اُس کی موجودہ نسلوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدیم بزرگی اور برتری کے نشہ میں اب تک بدست ہیں۔ حاجی لطف علی خان آذر نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ شیراز کے چھوٹے بڑے جوان اور بوڑھے صحبت اور جلسوں پر فریفتہ ہیں۔ کسب معاش اس قدر کرتے ہیں کہ کسی کے محتاج نہ ہوں۔ تھوڑی سی آمدنی پر قانع رہتے ہیں۔ ہمیشہ سیرگاہوں اور قبوہ خانوں میں جمع ہوتے ہیں۔

شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانہ میں پڑی ہے محمد بن قاسم جس نے مسلمانوں میں سب سے اوّل ہندستان پر لشکر کشی کی ہے شیراز کا بانی ہے یہ شہر پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ایک نہایت سرسبز شاداب قطعہ زمین پر آباد کیا گیا ہے۔ تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ ”شیراز کے مکانات بہت وسیع اور بازار پر رونق ہیں اور گھر گھر نہر جاری ہے۔ شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو“ پھر صفاریوں¹ اور دہلیویوں² کے عہد میں شیراز نے اور بھی زیادہ وسعت اور رونق حاصل کی۔ عضد الدولہ دہلی کے زمانہ میں اُس کی آبادی اس درجہ کو پہنچی کہ شہر میں اہل لشکر کی گنجائش نہ رہی اور شہر کے باہر ایک جدید عمارت بنائی گئی جس کا نام سوق الامیر رکھا گیا اور اُس کے بیٹے مصمام الدولہ نے اس جدید عمارت کے گرد پختہ فصیل کھنچوائی۔

شیراز کی آب و ہوا نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہے۔ شیخ سعدی اور خواجه حافظ اور اکثر پُرانے اور نئے شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں ازاں جملہ خواجه حافظ کا یہ شعر مشہور ہے:

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت کنار آب رکن آباد گلکش مصلیٰ را
شیخ علی حزیں نے بارہویں صدی ہجری میں جب کہ شیراز کی رونق بالکل جا چکی تھی اُس کو دیکھا ہے وہ اپنے سوانح عمری میں اُس کی بہت سی تعریف کے بعد لکھتا ہے کہ ”شیراز کی آب و ہوا دماغ کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتی ہے جس قدر چاہو کتاب کے مطالعہ اور فکر و غور

1- صفاریوں میں تین بادشاہ ہوئے چالیس برس اُن کی سلطنت رہی۔

2- دہلیویوں میں اٹھارہ بادشاہ ہوئے جن کی حکومت 248 برس رہی۔

مضامین میں مصروف رہو کبھی جی نہ اُکتائے گا۔“

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور عمارت کی لطافت و خوش اسلوبی باشندوں کے خیالات اور قوی پر عجیب اثر رکھتی ہے یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعر پاکیزہ طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں شیخ نے بوستاں کے دیباچے میں اہل شیراز کو اُن تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے جن سے وہ حالت سفر میں ملتا تھا شیراز سے جس قدر علماء و مشائخ و شعر و مصنفین ابتدا سے اخیر تک اُٹھے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا مذکور ہے اُن کی تعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر مناسبت رکھتی ہے اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لیے کچھ کم باعثِ افتخار نہ تھا۔

شیخ کا نام، نسب، ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلص ہے سرگور اوہلی نے اُس کی ولادت¹ 589 ہجری مطابق 1333ء میں لکھی ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتنا تک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتنا بک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی² کی جگہ تختِ شیراز پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا اس لیے اُس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ

1۔ اُس کی ولادت کا سال کسی نے نہیں لکھا صرف سالِ وفات سب نے لکھا ہے یعنی 691 ہجری اور اُس کی عمر 102 یا 110 یا 120 برس کی بتائی ہے پس کم سے کم عمر ماننے سے اُس کی ولادت 589 ہجری میں قرار پاتی ہے لیکن اس سے لازم آتا ہے کہ ابو الفرج ابن جوزی جو بغداد میں اُس کا جلیل القدر اُستاد تھا اُس کی وفات کے وقت جو کہ قطعاً 597 ہجری میں ہوئی ہے شیخ کی عمر نو برس سے زیادہ نہ ہو اور یہ بالکل خلاف واقع ہے اس لیے اُس کی عمر 102 برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔

2۔ بوستان میں تکلہ کو شاہانِ پیشین میں لکھا ہے حالانکہ سعدی اُس کے وقت میں پیدا ہوا تھا اس کا سبب یہ ہے کہ بوستان تکلہ سے چوتھے بادشاہ یعنی ابوبکر کے عہد میں لکھی گئی ہے پس شاہانِ پیشین سے وہ بادشاہ مراد ہیں جو ابوبکر سے پہلے تھے نہ وہ جو سعدی سے پہلے تھے۔

اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخدا اور متوزع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باب کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت بہت زیادہ کرتا تھا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبخ کو قرار دیا ہے چنانچہ وہ بوستان میں کہتا ہے:

ندانی کہ سعد مکان از چہ یافت نہ ہامون نوشت و نہ دریا شکافت

بخوردی بخورد از بزرگان قفا خدا داوش اندر بزرگی صفا

لیکن شیخ کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اُس کو کم سن چھوڑ کر مر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کی والدہ نے اُس کو تربیت کیا ہوگا کیونکہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اُس کی ماں زندہ تھی۔ کئی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ علامہ قطب الدین شیرازی جو کہ محقق طوسی کا شاگرد رشید اور ہولا کو خان کا مصاحب خاص تھا شیخ کا ماموں یا قریب کا رشتہ دار تھا مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے باہم ایسی بے تکلفانہ ہنسی اور چہل ہوتی تھی جو ماموں بھانجوں میں نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال شیخ اور علامہ دونوں ہم عصر تھے اور شاید کچھ قربت بھی رکھتے ہوں۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش حراج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالنے ہی شیراز اور اُس کے قرب و جوار میں علماء اور مشائخ اور فصحاء و بلخا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطہ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے بزرگوں

سے سنا تھا۔ قاعدہ ہے بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے تحصیل علم کا شوق اُس کو دامگیر ہوا۔ اگرچہ دارالعلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا۔ علمائے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ مدرسہ عضدیہ جو کہ عضد الدولہ دہلی نے قائم کیا تھا اور اُس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے لیکن اُس وقت ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل، رحم دل بامروت اور فیاض بادشاہ تھا مگر اُس کی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کی حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اُس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پا کر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے جنہوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے:

دلِ از محبت شیراز بگفتی مگر رفت وقت آنست کہ پری خبر از بغدادم
سعدی احب وطن گرچہ حدیث صحیح نتوان مُرد بختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ: میرا دل شیراز کی محبت سے تنگ آ گیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوں بختی سے مرانہیں جاتا۔

اُس زمانہ میں مسلمانوں کے بے شمار رے بلاد اسلام میں جا بجا کھلے ہوئے تھے

جہاں دور دور سے طالب علم آ کر علم تحصیل کرتے تھے۔ ہرات، نیشاپور، اصفہان، بصرہ اور بغداد میں خوبہ نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور معمور تھے ان کے سوا شام¹، عراق اور مصر وغیرہ جگہ جگہ مدرسے جاری تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہ بغداد نے حاصل کی تھی جس کو خوبہ نظام الملک طوسی نے 459 ہجری میں بنوایا تھا ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مدرسہ اس قدر نامور تھا کہ جو علماء یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے پھر اُن کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہتا تھا۔ امام ابو حامد غزالی، شیخ عراق عبد القادر سہروردی، استاد الامام ابو حامد عماد الدین موصلی اور بڑے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ شیخ کو اس مدرسہ میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوگی کہ اُس کا ہم وطن شیخ ابواسحاق شیرازی جس کا علم و فضل شہرہ آفاق تھا مدت تک اس مدرسہ کا متولی رہا تھا۔ جس وقت نظام الملک نے بغداد میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اول یہاں کا متولی شیخ ابواسحاق کو مقرر کیا تھا اور اس سبب سے اہل شیراز کو اس مدرسہ سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا۔

الغرض شیخ نے مدرسہ نظامیہ میں جا کر تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ یوستان میں اُس نے تصریح کی ہے وہاں سے اُس کے لیے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بغداد میں جن لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا اُن میں سب سے زیادہ مشہور اور نامور شخص علامہ ابوالفرج عبدالرحمن ابن جوزی ہے جس کا لقب جمال الدین ہے۔ یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ بے شمار کتابیں اس کی تصنیفات سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جن قلموں سے حدیث لکھی ہے اُن کا تراشہ میرے حجرے میں ہے۔ مرنے

1۔ ان میں سے مدرسہ ناصر یہ ملک الناصر صلاح الدین کا بنایا ہوا قبرس میں اور مدرسہ رواجیہ رواجہ کے پوتے زکی ابوالقاسم بیہ اللہ کا۔ اور نیز مدرسہ الشام خاتون بنت ایوب خواہر صلاح الدین کا اور دارالحدیث ملک عادل بن ایوب کا دمشق میں اور مستنصر یہ خلیفہ مستنصر باللہ کا بغداد میں اور صاحبیہ وزیر مافی الدین کا قاہرہ میں اور نور یہ نور الدین ارسلان شاہ صاحب موصل کا موصل میں بہت مشہور تھے۔ ان کے سوا جیسا کہ تاریخ ابن خلکان سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے مدرسے جیسا مدرسہ نقیہ، قاہرہ، عزیز یہ، عز یہ، نفیسیہ، بعلانیہ وغیرہ وغیرہ بیت المقدس، موصل، بغداد، دمشق اور اسکندریہ وغیرہ میں موجود تھے۔

کے بعد جب مجھ کو نہلائیں تو غسل کے لیے اُس تراشہ سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔ اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا۔

جس زمانہ میں شیخ بغداد میں علائہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا اُس وقت شیخ کی جوانی کا آغاز تھا۔ دولت شاہ سمرقندی اور سرگور او سلی نے لکھا ہے کہ ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بیعت کی تھی اور اُن سے علم تصوف اور طریق معرفت و سلوک حاصل کیا۔ اور پہلی مرتبہ انھیں کے ساتھ بیت اللہ کے حج کو گیا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ کیونکہ شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی وفات 561 ہجری میں یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے اُس کو صحبت رہی ہے اور ایک بار سفر دریا میں وہ اُن کے ساتھ رہا ہے۔

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں اُس کے ہم عمر اور ہمسر لوگ اُس کی خوش بیانی اور حُسن تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اُس نے اُستاد سے شکایت کی کہ فلاں طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائل علیہ بیان کرتا ہوں تو وہ حسد سے جل جاتا ہے اُستاد یہ سن کر شیخ پر غصے ہوا اور یہ کہا کہ اوروں کے رشک و حسد کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو بُرا نہیں سمجھتے۔ تم دونوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو وہ رشک و حسد سے اور تم بدگوئی و غیبت سے۔

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ برابر وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اور علائہ ابوالفرج ابن جوزی ہمیشہ اُس کو سماع سے منع کرتا تھا مگر شیخ کو سماع کا ایسا چسکا تھا کہ اس باب میں کسی کی نصیحت کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن علماء کی سوسائٹی آہستہ آہستہ اُس کے دل میں گھڑ کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں اُس کو ایک بد آواز قوال سے پالا پڑا اور بھرورت ساری رات اُس کو وہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈا سا اُتارا اور جیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں قوال کی نذر کیں۔ اصحاب مجلس کو اس حرکت سے تعجب ہوا۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کرامت مشاہدہ کی ہے۔ میرا مربی اُستاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا مگر میں نے اُس کے حکم

کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے میں آنا ہوا اور اس بزرگوار قوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی صحبت سے عالم طالب علمی ہی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اُس کے دل سے اُتر گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسہ میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اُس طریقہ کو چھوڑ کر اس کوچہ میں قدم رکھا۔ کہا درویش صرف اپنی جان بچانے میں کوشش کرتے ہیں اور علماء یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ دُبتوں کو بھی بچائیں۔

شیخ نے شعر میں اکثر یہ بات جتائی ہے کہ اُس کو کسی سرزمین کے ساتھ عراق یا بغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

بعد از عراق جائے خوش ندیدم ہوائے ساقی بزن تو اے زان پردہ عراقی

جس زمانہ میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا اگرچہ اُس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ظاہری شان و شوکت ہارون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستعصم باللہ سریر سلطنت پر متمکن تھا۔ اور اُس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لیے سنبھال لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور ارباب حرفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے عیش و عشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے۔ اور بڑے بڑے شہریار اور فرماں روا بارگاہ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ قصر خلافت کے آستانے پر ایک پتھر بمنزلہ حجر الاسود کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو امرا اور اعیان سلطنت قصر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسا دیتے تھے تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی وہاں ایک مدت پہلے سے رستہ کے تمام منظر اور بالا خانے کرایہ داروں سے رُک جاتے تھے۔ الغرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اور پھر اُسی آنکھ سے اُس دار الخلافہ کا بے چراغ ہونا جو چھ سو برس بوسہ گاہ و ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایہ اقتدار یورپ، ایشیا اور افریقہ پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اُس کی اولاد اور ہزار ہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا

تاتاریوں کی تیغ بے دریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحہ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اُس کی آنکھوں کے رو برو گزرے تھے جو ہلاکو خان کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک نہایت عمدہ سبق تھا جس نے اُس کے دل میں قوم کی دلسوزی بادشاہوں کی اصلاح رعایا کی ہمدردی اور ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا اور اُسی خیال کی بدولت اُس نے اپنی تمام عمر ایمانے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی۔ مستعصم باللہ کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ نے اُس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اُس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اُس کا ماتم دار اور سوگوار دنیا میں باقی نہ تھا۔ اس مرثیہ کی چند ابیات اس موقع پر نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

ابیات

- | ترجمہ | اشعار |
|---|--|
| 1 آسمان کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر زمین پر خون برسائے۔ | 1 آسمانِ راحق بود گر خون بارود بر زمین برزوال ملکِ مستعصم امیر المومنین |
| 2 اے محمد صلعم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجیے۔ | 2 ای محمدؐ گر قیامت می برآری سر ز خاک سر برآورین قیامت در میان خلق بین |
| 3 محل کے ناز پر دردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا۔ | 3 نازینانِ حرم را خونِ حلقِ نازنین ز آستانِ بگدشت و مارا خونِ دل از آستین |
| 4 زمانہ کی گردش اور دنیا کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیے یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائے گا۔ | 4 ز بہار از دور کیتی و انقلابِ روزگار در خیال کس نہ گشتی کا چنتانِ گرد و چین |

5 دیدہ بردار ایک دیدی شوکت بیت الحرام
قیصران روم سر بر خاک و خاقان بر زمین
5 جنھوں نے اُس بیت الحرام کی شان
وشوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر
اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑتے
اور زمین پر بیٹھتے تھے وہ ذرا آنکھ اٹھا کر
دیکھیں۔

6 خون فرزنداں عم مصطفیٰ شد ریختہ
ہم برآں خاکی کہ سلطانان نہادندے جبین
6 کہ پیغمبر خدا کے بنی عم کا خون اُس خاک
پر بہہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑتے
تھے۔

7 بعد ازین آسایش از دنیا نباید چشم داشت
قیر در انگشتری ماند چو بر خیزد تکمین
7 آئندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں
چاہیے کیونکہ انگٹھی پر سے جب نکلیں جاتا
رہتا ہے تو نری کلنس رہ جاتی ہے۔

8 دجلہ خونا بست زین پس گر نہد سر در نشیب
خاک نخلستان بطحا را کند با خون عجمین
8 دجلہ کا پانی نکتہ لہو ہو گیا ہے اگر اب
جاری رہے گا تو نخلستان بطحا کی خاک کو
خون سے رنگین کر دے گا۔

9 نوح لائق نیست بر خاک شہیدان مذاککہ هست
کترین دولت مرایشانرا بہشت برترین
9 شہیدوں کی خاک پر نوح کی کیا ضرورت
ہے کیونکہ اُن کے لیے ادنیٰ نعمت فردوس
مہین ہے۔

10 لیکن از روے مسلمانی و راہ مرحمت
مہربان را دل بسوزد در فراق نازنین
10 ہاں مگر رحم اور اسلام کی ہمدردی کے سبب
دوست کا دل دوست کی جدائی میں گلوہتا
ہے۔

11 ہاں تا فردا کہ بنی روزلو و رنجور
کز لحد باروے خون آلودہ بر خیزد دفن
11 کل تک صبر کرو قیامت کے دن دیکھ لینا
کہ قبر سے اہل قبر لہو بھرا منھ لے کر اٹھیں
گے۔

12 تکیہ بردنیا بناید کرد دل بروی نہاد کا سامان
12 یارو دنیا پر بھروسہ کرنا اور اُس سے دل
گا ہے بمہر است ای برادر گہ بکین
لگانا نہیں چاہیے کیونکہ آسمان کبھی دوست
ہے اور کبھی دشمن۔

13 زور بازوی شجاعت بر نیاید با اجل چون
13 شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا
قضا آید نما نہ قوت رای رزین
اور جب قضا آتی ہے تو رائے صائب کی
قوت جاتی رہتی ہے۔

14 تیغ ہندی بر نیاید روز ہيجا از نیام
14 جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے
شیر مردیرا کہ باشد مرگ پنهان در کین
اس کی اصل تلوار لڑائی کے دن میان
سے باہر نہیں نکلتی۔

15 تجربت بیفائدہ است آنرا کہ برگردید
15 جب نصیبہ پلٹ گیا پھر اُس کا امتحان کرنا
بخت حملہ آوردن چه سود آنرا کہ برگردید زین
بے فائدہ ہے اور جب زین اُلٹ گیا پھر
حملہ کرنا فضول ہے۔

16 کر گسانند از پے مردار دنیا جنگجو
16 یارو مردار دنیا کے لیے گدھ آپس میں
ای برادر گر خردمندی چو سیرغان نشین
لڑ رہے ہیں اگر تم عقلمند ہو تو یہ سیرغوں کی
طرح الگ بنھو۔

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے نالائق اور ناشدنی خلیفہ کا مرثیہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا۔ اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی، نیکی اور انصاف بالکل نہ تھا۔ تکبر اور غرور نے اُس کے دماغ کو مختل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار اُس کے بیٹے ابو بکر نے اہل سنت کی حمایت اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے روکتے کھڑے ہوتے ہیں مگر اُس نالائق خلیفہ نے اس کا کچھ تذکر نہ کیا۔ لیکن اس سے شیخ کے مرثیہ لکھنے پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفیر سمجھو۔ مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اُس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جھے ہوئے تھے ایک بارگی

اُن میں تزلزل آگیا اور چند روز میں اُن کا اقتدار صفحہ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے برگ و پئے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی ملا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برابر اسلام کی حمایت تھی اُس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آبِ باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشمِ زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حسان بن ثابتؓ موجود ہوتے تو اُن کو بھی ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے:

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہل وفا کہ اپنے مننے سے مہر و وفا کا نام مٹا
 القصة شیخ مدرسہ نظامیہ سے نکل کر مدت دراز تک ایشیا اور افریقہ میں برابر سیر و سیاحت کرتا رہا جب کتاب کے مطالعہ سے اُس کا جی سیر ہو گیا تو نسخہ کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اُس نے تیس برس کی عمر تک تحصیل علم کی ہے اور تیس برس سیر و سفر میں اور تیس برس تصنیف و تالیف میں اور تیس برس عزالت نشینی میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ تیس تیس برس کے چار مساوی حصے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں۔ اور غالباً یہ مضمون منوشا ستر سے اخذ کیا گیا ہے جس میں عمر کو ایسے ایسے تین یا چار حصوں پر تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصہ تحصیل علم اور سیر و سفر میں بسر ہوا۔ نجات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ عالم صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرہ کامل رکھتا تھا۔ اگرچہ اُس کی شہرت طبقہ علماء میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرہ شعرا میں ہوئی مگر اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق اور سلیکھ ہوا عالم تھا۔ بعض موقعوں پر فقہاء اور فضا کے مجموعوں میں اُس کو بحث اور مناظرہ کا اتفاق ہوا ہے اور اخیر کو اُس کی رائے سب پر غالب رہی ہے۔ ایک بار غالباً شام یا عراق کے کسی شہر میں جہاں اُس کے جان پہچان کم تھے کسی تقریب سے قاضی شہر کی مجلس میں اُس کا گزر ہوا۔ اُس وقت شیخ نہایت شکستہ حال تھا اور مجلس میں تمام علماء و فقہاء کمال ترک و احتشام سے بیٹھے تھے۔ شیخ سادگی سے سب کے برابر جا بیٹھا۔ خدام نے جھڑک کر وہاں سے اُٹھا دیا اور مشکل سے پائیں مجلس میں جگہ ملی۔ اُس وقت

کسی مسئلہ میں گفتگو ہو رہی تھی اور کسی سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے دور ہی سے باواز بلند کہا کہ اگر مجھ کو اجازت ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں۔ سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہوا۔ شیخ نے اس مسئلہ کو بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا۔ چاروں طرف سے تحسین و آفرین ہونے لگی قاضی نے مسند چھوڑ دی اور عمامہ سر سے اتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے کہا یہ غرور کا اوزار مجھے نہیں چاہیے۔ جب لوگ مجھ کو حقیر اور ذلیل معلوم ہوں گے تو پھٹے پڑانے کپڑے والوں سے میں بھی تمھاری طرح ناک چڑھاؤں گا۔ اسی طرح اور بہت سے طعن اور ملامت کے الفاظ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ شیخ نے یہ اپنی سرگزشت بوستان میں اس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر شخص کی سرگزشت ہے مگر اخیر کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خاص اپنی روداد لکھی ہے۔ شیخ کی تحصیل اور مبلغ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے مگر ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے فلسفہ اور حکمت کی طرف بہت کم توجہ کی تھی۔ زیادہ تر اُس کی ہمت دینیات اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مصروف رہی اور خاص کر وعظ اور خطابت میں جس کی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی اُس کو عمدہ دستگاہ تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اُس کے ہم جماعت لوگ اُس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلاد شام میں اُس نے مدتوں وعظ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں وعظ کہہ رہا تھا اور اہل مجلس نہایت افسردہ دل تھے جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ میں اس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا نحن اقرب الیہ من حبل الورد کہ ایک راہرو وہاں سے گزرا۔ اُس نے میرا بیان سن کر ایسا پُر جوش نعرہ مارا کہ اور لوگ بھی اس کے ساتھ چیت گئے اور تمام مجلس گرم ہو گئی۔

شیخ کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی۔ عرب، شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اُس کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ وعظ اور بحث و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا۔ اور صرف روزمرہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی بلکہ عربی قصائد فصیح اور بازمہ اُس کے کلیات میں موجود ہیں۔ اس کے سوا بت خانہ سومنات کے قصہ میں اُس نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ژند کی زبان جانتا تھا۔ سرگورادسلی لکھتے ہیں کہ ایشیا ناک

جنرل کے ایک پرچہ مطبوعہ 1843ء میں فرانس کے مشہور محقق ام گارسن ڈی ٹیسی نے لکھا ہے کہ ”سعدی پہلا شخص ہے جس نے ہندستانی زبان یعنی ریختہ میں جب کہ وہ سومات اور گجرات میں آیا تھا شعر کہا ہے“ مگر یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اس سے پہلے ہندستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اس زمانہ میں ہوا ہے جب کہ ریختہ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کی وفات کو تقریباً چار سو برس گزرے ہیں کہتے ہیں کہ ریختہ میں سب سے پہلے اُس نے شعر کہا ہے اور یہ تین شعر اُس کے مشہور ہیں۔

اشعار

تشفہ چو دیدم بر رخس کفتم کہ یہ کیا دیت ہے گفتا کدراے بادے اس ملک کی یہ دیت ہے
ہناتھیں کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے
سعدی بگفتا ریختہ در ریختہ دُر ریختہ شیر و شکر آمینتہ ہم ریختہ ہم گیت ہے
مرزار فیع سودا نے اپنے تذکرہ میں اُن اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے
مگر حکیم قدرت اللہ خان قاسم نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس شخص کو سعدی شیرازی سمجھنا
جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے محض غلط ہے۔

سرگور اوکلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اُس نے اٹھارہ مختلف زبانیں اُن ملکوں کی لکھی ہیں جہاں جہاں وہ سیاحی کو گیا ہے۔ اس بیان میں ظاہراً کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ایک مدت دراز تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں سفر کرتا رہا ہے اور اکثر جگہ اُس نے بہت بہت دیر تک قیام کیا ہے۔ شام، عراق، فلسطین، مصر، یمن اور ہندستان میں مدت دراز تک مقام کرنا خود اُس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے پس ضرور ہے کہ وہ ان ملکوں کی زبان سے کافی واقفیت رکھتا ہو اس کے سوا اُس نے اور بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے جس میں سے اکثر کا ذکر گلستان اور بوستان میں کیا ہے۔

شیخ کی سیاحت کا حال

سرگوراو کلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطا کے سوا شیخ سعدی سے بڑھ کر اور کوئی سیاح ہم نے نہیں سنا۔ اُس نے ایشیائے کوچک، بربر، حبش، مصر، شام، فلسطین، آرمینیا، عرب جملہ ممالک ایران، اکثر ممالک توران، ہندستان، رودبار، دہلیم، کاشغر اور تاجکوں سے آگے تک اور بصرہ و بغداد سے ستہین دال¹ تک کی سیر کی تھی، صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کو چار دفعہ ہندستان میں آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ازاں جملہ ایک دفعہ پٹھان اغمش کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دہلی آیا ہے، ہمارے نزدیک یہ مضمون بالکل بے سرو پا ہے۔ اغمش کوئی بادشاہ ہندستان میں نہیں ہوا شاید سلطان اتمش کے دھوکے میں اغمش لکھا گیا۔ بیشک شیخ نے اغمش کا ذکر گلستان میں ایک جگہ کیا ہے جہاں یہ لکھا ہے ”سربنگ زادہ را بردر سراے اغمش دیدم“ مگر ہندستان میں کوئی اغمش یا سراے اغمش نہیں سنی گئی۔ سعدی اور امیر خسرو کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ اکثر تذکرہ نویسوں کو یہ شبہ ہوا ہے۔ شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ہندستان میں آیا ہے۔ مگر اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے بلکہ شیخ اور امیر خسرو کے عصر کا مقابلہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا امیر کے ملنے کے لیے آنا خلاف قیاس ہے خسرو کی ولادت 651 ہجری میں ہوئی ہے جب کہ شیخ کی عمر ستر برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب اگر امیر خسرو کی شہرت بفرس محال پچیس برس ہی کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی تھی تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہیے۔ پس یہ کیونکر خیال میں آتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانہ وقت اور مقبول خاص و عام ہوا ایک پچیس برس کے لڑکے کی شہرت سن کر ایران سے ہندستان آئے۔ البتہ معتبر حوالوں سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سلطان

1۔ ستہین دال سے مراد شاید سدسکندری ہے کیونکہ شیخ نے ایک جگہ اپنے دیوان میں تصریح کی ہے کہ میں سدسکندری تک گیا ہوں۔

غیاث الدین بلبن کے بیٹے قآن محمد سلطان ناظم ملتان نے جس کو خان شہید کہتے ہیں شیخ سے دوبار درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں آئیے۔ اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے اس لیے ان کا کلام بھی شیخ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا۔ شیخ اس وقت بہت معمر ہو گیا تھا اس سبب سے خود نہ آ سکا۔ لیکن دونوں دفعہ اپنے دودویوں اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خان شہید کو بھیجے اور امیر خسرو کی نسبت یہ لکھا کہ اس جو ہر قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاہیے۔

شیخ کا ہندوستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ہے۔ صرف ہندوستان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سومات سے نکل کر ایک بار مغربی ہندوستان کا دورہ کیا ہے اور وہاں سے بحر ہند اور بحر عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ہے۔

شیخ کے سفر جس قدر گلستان اور ہندوستان سے ثابت ہوتے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراسان ترکستان اور تاتاریک گیا ہے اور بلخ و کاشغر وغیرہ میں مقیم رہا ہے جنوب میں سومات تک آیا اور ایک مدت یہاں ٹھہرا اور سومات سے مغربی ہندوستان میں پھر کر دریا کی راہ سے عرب چلا گیا۔ شمال و مغرب کی طرف عراق عجم، آذربائیجان، عراق، عرب، شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک میں بارہا اُس کا گزر ہوا ہے۔ اصفہان، تبریز، بصرہ، کوفہ، واسط، بیت المقدس، طرابلس الشرق، دمشق، دیار بکر اور اقصائے روم کے شہروں اور قریوں میں مدت دراز تک اُس کی آمد و رفت رہی ہے۔ مغرب کی جانب عرب اور افریقہ میں اُس کا بار بار جانا اور وہاں ٹھہرنا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان سے مراجعت کے وقت یمن میں جانا۔ صنعا میں ایک مدت تک قیام کرنا۔ حجاز میں پہنچنا۔ اسکندریہ۔ مصر اور حبش کے واقعات اُس کے کلام میں مذکور ہیں۔

شیخ نے دریا میں بھی بارہا سفر کیا ہے۔ خلیج فارس، بحر عمان، بحر ہند، بحر عرب، بحر قلزم اور بحر روم میں اُس کے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں۔ جمہور انسا نکلو پڈیا میں لکھا ہے کہ وہ یورپ کے اکثر ملکوں میں پھرا ہے لیکن شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کیے ہیں اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہوتا ہے وہ ایک سفر کا حال ہندوستان میں اس طرح لکھتا ہے کہ بیابان فید میں ایک رات

نہند کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں چلتے چلتے سر راہ پڑ کر سو رہا پیچھے سے ایک شتر سوار آیا اور اُس نے اونٹ کی نکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے کا ارادہ کیا ہے جو جس کی آواز سن کر بھی نہیں اٹھتا، بیابان فید جس کا اس حکایت میں ذکر ہے ایک صحرا ہے لق و دق چھ سو میل لمبا اور چار سو میل چوڑا ہے۔ جو حجاج کو فہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں اُن کے رستے کے پتھوں بچ فید ایک بستی ہے جس کے نام سے یہ صحرا مشہور ہے۔ فید کو فہ سے تقریباً تین سو پچیس میل ہے اور اسی قدر مسافت پر وہاں سے مکہ معظمہ ہے۔ اس صحرا میں پانی نہایت کمیاب ہے اور آبادی کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسی راہ سے پیادہ پانچ کو جانا ظاہر کرتا ہے کہ شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں اٹھائی ہیں۔

کریم خان ژند نے اپنے عہد حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطہ بنوایا ہے جو ہفتن کے نام سے مشہور ہے اُس میں سات مجہول الاسم درویشوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں اور احاطہ کے دروازہ پر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی شبیہیں نصف قد کی لگی ہوئی ہیں۔ کپتان کلارک نے جو بوستان کا ترجمہ انگریزی میں چھاپا ہے۔ اُس میں شیخ کی اُس تصویر کا فوٹو گراف بھی چھاپا ہے شیخ کی شبیہ میں ایک کنگول اُس کے ہاتھ میں اور ایک تہر اُس کے کندھے پر ہے جو کہ اُس ملک کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت ہے۔

شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سرو سامان اور متوکل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے۔ اور بعض موقعوں پر اُس کو حالت سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں۔

ساتویں صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں جب کہ صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ فلسطین میں ختم نہ ہوا تھا اور مسلمان اور عیسائیوں کے باہم سخت خصومت اور عداوت ہو رہی تھی شیخ پر ایک سخت واقعہ گزرا ہے جس کا ذکر گلستان کے دوسرے باب میں کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار اہل دمشق سے ناراض ہو کر اُس نے بیابان قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا تھا اور آدمیوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر وہاں کے عیسائیوں نے اُس کو پکڑ کر قید کر لیا۔ اُس وقت طرابلس الشرق یعنی مشرق کی ٹریپولی میں شہر کے استحکام

1۔ بنی صاحب ایک سیاح نے اپنے ایران کے سفر نامہ میں اس تصویر کا حال مفصل لکھا ہے۔

اور حفاظت کے لیے شہر میں خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی اسیروں سے (جن کو یورپ کے عیسائی بلکیر یا اور ہنکری وغیرہ سے گرفتار کر کے لائے تھے) مزدوری کا کام لیا جاتا تھا۔ شیخ کو بھی یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگایا۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی جو شیخ کا واقف کار تھا اُس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اُس سے پوچھا کہ یہ کیا حالت ہے۔ شیخ نے کچھ درد انگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قدرت ہے۔ جو شخص یگانوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے بچہ میں گرفتار ہے۔ رئیس حلب کو اُس کے حال پر رحم آیا اور دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا۔ اُس کی ایک بیٹی ناکتھ تھی شیخ کا نکاح سودینار مہر پر مقرر کر کے اُس کے ساتھ کر دیا۔ کچھ مدت وہاں گزری۔ مگر بیوی کی بد مزاجی اور زبان درازی سے شیخ کا دم ناک میں آ گیا۔ ایک بار اُس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا کہ آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دس دینار دے کر خریدا ہے؟ شیخ نے کہا ہاں بیشک میں وہی ہوں دس دینار دے کر مجھے خریدا اور سودینار پر آپ کے ہاتھ بیچا۔

نجات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بیت المقدس اور شام کے شہروں میں سقائی کی ہے۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہے جس کا ذکر اس حکایت میں کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے اُس پر ایسی ایسی تکلیفیں اور سختیاں اکثر گزری ہیں۔ وہ گلستان میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے کبھی زمانے کی سختی اور آسمان کی گردش کا شکوہ نہیں کیا۔ مگر ایک موقع پر دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا۔ اسی حالت میں غمگین اور تنگدل کوفہ کی جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا کہ جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے۔ اُس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے تنگے پاؤں غنیمت سمجھے۔

عالم غربت میں کبھی کبھی عُسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا مگر شیخ ایسے موقعوں پر خودداری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ ایک سال اسکندریہ میں جب کہ شیخ وہاں موجود تھا نہایت سخت قحط پڑا اور درویشوں پر بہت سختی گزرنے لگی۔ اُس زمانے میں وہاں ایک بیخوار نہایت دولت مند تھا۔ غریبوں اور پردیسیوں کو اُس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی۔ کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے شیخ کے پاس آئے اور اُس بیخوار کے ہاں دعوت میں چلنے کی تحریک کی شیخ نے اُن کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر

بھی جائے تو بھی کتے کا جھوٹا نہیں کھاتا۔

شیخ کے واقع سفر میں جو کہ اُس نے گلستان اور بوستان میں بیان کیے ہیں سب سے زیادہ عجیب سومنات کا واقعہ ہے جو بوستان کے آٹھویں باب میں مذکور ہے یعنی شیخ لکھتے ہیں کہ جب میں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اُس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بے جان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اُس سے پوچھا یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں۔ اور اُس کے سامنے مورت کی تخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اُن کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بد اعتقادی سے نہیں کہی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں۔ لیکن چونکہ میں نووارد ہوں اور اسرار نہانی سے ناواقف ہوں اس لیے اس کی حقیقت دریافت کرنی چاہتا ہوں تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اُس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ۔ تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں رات بھر وہاں رہا صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اُس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے یہ دیکھتے ہی سب جے جے پکارنے لگے جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا ”کیوں اب تو کچھ شبہ باقی نہیں رہا؟“ میں نے ظاہر داری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بظاہر چند روز کے لیے برہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا اور مورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا جس کے پیچھے ایک پجاری چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی۔ معلوم ہوا کہ جب اُس ڈور کو کھینچتا ہے فوراً اُس مورت کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے اسی کو عام لوگ اُس کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اُس پجاری نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو گیا وہ کھیانا سا ہو کر وہاں سے بھاگا۔ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑا اور اس خوف سے کہ کہیں مجھ کو

پکڑوا کر مروانہ ڈالے اُس کو پکڑ کر ایک کنویں میں گرادیا۔ اس کے بعد فوراً میں وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندستان میں ہوتا ہوا یمن کے رستے حجاز میں پہنچا۔

اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پجاری اور سینکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سینکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اُس کے سوا کوئی تنفس باقی نہ رہا اس کے سوا ایسے سانے کے وقت جب کہ مندر میں کوئی تنفس موجود نہ تھا پردہ کے پیچھے ایک پجاری کا ذور تھام کر بیٹھنا کس غرض سے اور کیوں تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید اصل واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنویں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو مگر اُس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ کے تمام جزئیات کی تصویر کشی سے پوری پوری نہیں کھینچ سکی۔ اصل یہ ہے جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہہ کر اصل واقعہ سے دور جا پڑتا ہے۔ پس اگر اس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کا اُس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً شیخ نے بوستان کے اسی باب میں ایک بادشاہ زادہ کی حکایت صرف گیارہ بیت کی لکھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھوڑے سے گر کر اس کی گردن کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ہر پھر نہ سکتی تھی مگر ایک حکیم کے علاج سے اچھی ہو گئی۔ کسی قدر صحت کے بعد جب طبیب ملے کو آیا تو اُس کی طرف کچھ التفات نہ کیا۔ طبیب وہاں سے دل میں ناخوش ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے روز ایک دوا بھیجی کہ اس کی دھونی سے بالکل آرام ہو جائے گا۔ اُس سے بادشاہ کو ایک چھینک آئی اور اُس کی گردن جیسے چوٹ لگنے پر ہو گئی تھی ویسی ہی پھر ہو گئی۔ اسی حکایت کو شیخ نے ایک اور 34 بیت کی مثنوی میں جو بحر ہزج میں ہے بیان کیا ہے اور یہ اُس کی کلیات میں موجود ہے۔ ان دونوں مثنویوں میں قصہ کے جزئیات مختلف ہیں۔ مختصر حکایت میں سرزمین یونان کا حکیم اور طولانی حکایت میں صرف حکیم لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بوٹی بھیجی تھی اور دوسری جگہ ایک تخم بھیجا تھا۔ ایک جگہ

بادشاہ کا قصہ لکھا ہے اور دوسری جگہ ایک نبرد آزما کا۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ اُسی دوا کی دھونی سے چھینک آئی دوسری جگہ چھینک وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم میں بشرطیکہ ناظم کو حسن بیان اور زینت الفاظ کا پورا پورا خیال ہو قصبہ کے جزئیات کا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا نہایت دشوار ہے۔ پس بہ نسبت اس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے یہ بہتر ہے کہ اس کے بیان کو اس مقام پر اداے مطلب میں قاصر سمجھا جائے۔

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعد زنگی کے ابتدائے حکومت میں تحصیل علم کے لیے ترک وطن اختیار کیا تھا۔ سعد زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشین ہوا اور 623 ہجری میں وفات پائی۔ غالباً شیخ شیراز سے نکل کر سعد زنگی کے زمانہ میں وطن نہیں آیا۔ کیونکہ اُس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت نہایت ابتر و خراب دیکھی تھی۔ اتنا تک اوزبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے حملے اور شہر کا تاخت و تاراج ہونا اپنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا۔ مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قتلغ خان ابو بکر اپنے باپ کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو اُس نے فارس کو جو دو سو برس سے مورد آفات و حوادث تھا چند روز میں سرسبز و شاداب کر دیا۔ اگرچہ مورخین نے اس کی تعریف میں بہت مبالغے کیے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اُس نے اپنی خوبیوں کے سبب بے انتہا شہرت اور نیکنامی حاصل کی تھی۔ اطراف و جوانب سے مشائخ و زہاد اُس کی شہرت سن کر آتے اور اُن کی کمال تعظیم و احترام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں، عبادت خانے، مدرسے اور مسجدیں جو دیران ہو گئی تھیں اُس کے عہد میں آباد کی گئیں۔ اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لیے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک شفا خانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حافظ طبیب اُس پر مامور کیے۔ اپنا دانشمندی اور حسن تدبیر سے ملک فارس کو ہمیشہ مغول تارک کے سیلاب بلا سے جس کی کہیں پناہ نہ تھی محفوظ رکھا۔ اور 623ء سے 658ء تک سلطنت کی مدت تک اُس کے عہد میں بھی شیخ نے شیراز کا رخ نہیں کیا اور اطراف

و جوانب میں سیر و سیاحت کرتا رہا۔ مگر جب ابوبکر کا شہرہ دور و نزدیک برابر سننے میں آیا اور وطن کا اشتیاق بھی حد سے زیادہ گزر گیا اور وطن میں قرار واقعی امن و امان قائم ہو گیا تب شام سے عراق عجم ہوتا ہوا اور اصفہان میں ٹھہرتا ہوا جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے مفہوم ہوتا ہے شیراز میں پہنچا۔ شیخ کی کلیات میں ایک قطعہ ملا ہے جس سے ثابت ہے کہ اُس نے ایک مدت دراز کے بعد ابوبکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف معاودت کی تھی۔ وہ قطعہ مجتہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعہ

ترجمہ	اشعار
1 تجھ کو معلوم نہیں؟ کہ میں نے پردیس میں ایک مدت تک کیوں توقف کیا۔	1 ندانی کہ من در اقلیم غربت چہ روزگارے بکردم درنگی
2 میں ترکوں کی چپقلش سے نکل بھاگا کیونکہ ملک حبشی کے بالوں کی طرح ژولیدہ ہو رہا تھا۔	2 برون رتم زنگ ترکان کہ دیدم جہان درہم افتادہ چون موے زنگی
3 سب آدمی کے بچے تھے لیکن خونخواری میں بھیڑیوں کی طرح تیز ناخن رکھتے تھے۔	3 ہمہ آدمی زاد بودند لیکن چو گرگان بخونخواری تیز جنگی
4 شہر کے اندر فرشتہ خصلت لوگ تھے اور باہر شہر کے لوگ جنگی مانند شیروں کے تھے۔	4 درون مردی چون ملک نیک محضر برون لشکرے چون ہزیران جنگی
5 جب میں پلٹ کر آیا تو ملک کو آسودہ پایا کہ درندوں نے درندگی کی خصلت چھوڑ دی تھی۔	5 چو باز آدم کشور آسودہ دیدم پلنگان رہا کردہ خوئے پلنگی
6 اگلے زمانہ میں جب کہ ملک کو آشفہ اور پریشان اور جنگ دیکھا تھا ملک کا وہ حال تھا۔	6 چنان بود در عہد اول کہ دیدم جہان پرز آشوب و تشویش و جنگی

7 چنیں شد در ایام سلطان عادل | 7 اور اب بادشاہ عادل ابو بکر بن سعد زنگی
 اتابک ابو بکر بن سعد زنگی | کے عہد میں یہ حال ہو گیا ہے۔

شیراز میں پہنچ کر ظاہر آشخ نے جامہ علم و فضیلت اُتار کر بالائے طاق رکھ دیا تھا کیونکہ
 اتابک ابو بکر میں باوجود اُن تمام خوبیوں کے جو اوپر مذکور ہوئیں ایک نہایت سخت عیب بھی
 تھا۔ وہ ہمیشہ علماء و فضلاء سے بدگمان رہتا تھا اور جاہل فقیروں اور درویشوں کو بہت کچھ دیتا تھا
 اور اُن کے ساتھ کمال ارادت و عقیدت ظاہر کرتا۔ اسی بدگمانی کے سبب سے چند جلیل القدر
 آئمہ و علماء کو اُس نے جبراً شیراز سے نکلوا دیا تھا۔ از انجملہ امام صدر الدین محمود واعظ اور امام
 شہاب الدین تودہ پشتی اور مولانا عز الدین ابراہیم قسی کو کہ اقسام علوم میں یگانہ روزگار تھے
 بہت زجر و تہدید کے ساتھ شیراز سے نکلوا دیا۔ قاضی عز الدین علوی جو کہ سندی سید اور
 دارالملک کا قاضی القضاۃ تھا اُس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا۔ صاحب سعید عمید الدین
 اسعد کو جو کہ بے مثل ادیب تھا اور سعد زنگی کا نہایت عالی مرتبہ وزیر تھا ماخوذ کیا اور معہ اُس کے
 بیٹے تاج الدین محمد کے ایک قلعہ میں قید کر دیا یہاں تک کہ وہ قید ہی میں مر گیا۔

اسی سبب سے اہل علم اپنا کمال علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اور اکثر جھلّا مشائخ کے
 لباس میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ تاریخ و صاف میں لکھا ہے کہ ایک جاہل آدمی مشیخت مآب بن کر
 ابو بکر کے دربار میں آیا۔ اتابک نے اُس کی بہت تعظیم و تکریم کی اور جب نماز مغرب کا وقت
 آیا تو اسی کو امام بنایا۔ شاہ صاحب نے قرأت غلط پڑھی مگر جس قدر اُنھوں نے قرأت میں
 غلطیاں کیں اُسی قدر اتابک کو اُن کے ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دے کر اُنھیں
 رخصت کیا۔

پس شیخ کے لیے علماء کے لباس میں رہنا زیادہ خطرناک تھا کیونکہ بہت سی صفات اُس
 میں ایسی جمع تھیں جن کے سبب سے اُس کا مرجع خلافت بننا ایک ضروری امر تھا۔ مثلاً علم و فضل،
 شاعری، لطیفہ گوئی و بذلہ سخا، فقر و درویشی وغیرہ وغیرہ اور اہل علم کے مرجع خلافت بننے سے
 ابو بکر ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہوں اور عالموں کے چال چلن پر خوردہ گیری
 کرنی ریاکار فقیروں اور جاہل درویشوں کی قلعی کھولنے اور اسی طرح کے اور بہت سے مفید
 خیالات اپنی نظم و نثر میں ظاہر کرنے شیخ کا اصلی مقصد تھا اور اس غرض کے لیے علماء اور واعظین

کے لباس میں رہتا ہرگز مناسب نہ تھا ظاہر ا وہ اسی سبب سے جیسا گلستان کے دیباچہ میں مذکور ہے ابو بکر کے دربار میں بہت کم جاتا تھا۔ زیادہ تر سعد بن ابی بکر کو جس کا نہایت دردناک مرثیہ شیخ کے کلیات میں موجود ہے۔ اس سے ارادت اور عقیدت تھی اور اسی کے نام پر گلستان لکھی گئی ہے۔

خود مختار سلطنتوں میں کوئی شے رائے کی آزادی اور خاص کر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔ مگر شیخ نے جس کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا اس فرض کو پورا پورا ادا کیا۔ سلاطین عہد کے اخلاقی عیب اور ان کی بدخصتیں جس طرح اُس نے بیان کی ہیں آزاد سلطنتوں میں بھی اس سے زیادہ لکھنی مشکل ہیں مگر اُس نے ایسے لطیف پیرایوں میں ان پر چونٹیں کی ہیں کہ کسی کو اُس پر گرفت کا موقع نہیں ملا۔ اکثر سلاطین سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر اُس نے تعریفیں کی ہیں۔ کہیں مدحیہ قصائد میں اول مدح و ستائش کی تھوڑی سی چاٹ دے کر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے اور ان کو ظلم و تعدی کے بُرے نتائج سے متنبہ کیا ہے اور طرح طرح سے رعیت کے حقوق بتائے ہیں اور ان کی بے اعتدالیاں ظاہر کی ہیں۔ اتنا بک جو علماء کا مخالف اور مشائخ و زہاد کا حد سے زیادہ معتقد تھا اس کی تنبیہ کے واسطے گلستان اور بوستان میں اُس نے بہت سی حکایتیں لکھی ہیں۔ مثلاً گلستان کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں رہتا تھا اور درختوں کے پتے کھاتا تھا۔ ایک بادشاہ اُس کی زیارت کو گیا اور اُس کو شہر میں لے آیا اور ایک عمدہ بستان سرا میں اتارا۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت لونڈیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کے آرام و آسائش پائی شاہ صاحب نے خوب رنگ و روغن نکالا۔ بہت دصورت بالکل بدل گئی۔ ایک دن بادشاہ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا اور کہا جس قدر کہ مجھ کو علماء اور زہاد سے محبت ہے ایسی اور کسی گروہ سے نہیں فیلسوف و زیر نے عرض کیا حضور! شرط دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کی جائے اور اس لیے علماء کو روپیہ دینا چاہیے تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں اور زاہدوں کو کچھ نہ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے زہد پر قائم رہیں۔

ایک اور اس سے زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اسی باب میں لکھی ہے جو بالکل

اتابک ابوبکر کی حالت کے مناسب ہے یعنی ”ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش آئی اُس نے منت مانی کہ اگر اس میں کامیابی ہوگی تو اس قدر روپیہ زاہدوں کی نذر کروں گا جب اُس کی مراد پوری ہوگی تو اپنے عہد کے موافق روپیوں کی تھیلی غلام کو دی کہ زاہدوں کو جا کر دے آئے غلام بہت ہوشیار اور زیرک تھا۔ سارے دن ادھر ادھر پھرا اور شام کو تھیلی ہاتھ میں لیے جیسا گیا تھا ویسا ہی چلا آیا اور عرض کیا حضور! ہر چند ڈھونڈا مگر کوئی زاہد نہیں ملا۔ بادشاہ نے کہا تو کیا بکتا ہے! میرے نزدیک اس شہر میں چار سو زاہد سے کم نہ ہوں گے کہا حضور! جو زاہد ہیں وہ لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں۔ بادشاہ یہ بات سن کر ہنس پڑا اور فرمایا کہ جتنی مجھ کو درویشوں اور خدا پرستوں سے عقیدت ہے اُسی قدر اس مردود کو ان سے عداوت ہے مگر کہتا سب سچ ہے“ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں گلستان اور بوستان میں موجود ہیں۔ گلستان کی ایک حکایت میں جو کہ جدال سعدی کے نام سے مشہور ہے اُس نے نہایت خوبصورتی سے سلاطین عہد اور مشائخ روزگار کے عیب اور بُرائیاں بیان کی ہیں۔ اس حکایت میں اُس نے اپنا اور ایک درویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ہے جس میں مخالف کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاہوں کا طرفدار اور مداح قرار دیا ہے مخالف بار بار درویشوں کی تعریف اور دولتمندوں کی مذمت کرتا ہے اور شیخ ہر دفعہ اُس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قائم کرتا ہے ویسی ہی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ہے۔ اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ہے جو محض درویشوں اور تو نگروں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے لکھا گیا ہے۔

بادشاہوں کے جور و ظلم اور بے باکی و سفاکی دیکھتے دیکھتے شیخ کے دل میں فی الواقع بنی نوع کی خیر خواہی کا سچا جوش پیدا ہو گیا تھا جس کو کوئی خوف اور اندیشہ روک نہ سکتا تھا۔ ایک بار جب کہ وہ حج کر کے تہریز میں پہنچا اور وہاں کے علماء اور صلحا سے ملاقات کی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کا چھوٹا بھائی خواجہ علاء الدین جوینی جو کہ سلطان ابا قاسم^۱ کے معتمد وزیر تھے اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے اُن سے بھی ملاقات کرے ایک روز اُن سے ملنے کا ارادہ کر کے چلا۔ راہ میں دیکھا ابا قاسم

کی سواری آتی ہے اور اُس کے دونوں وزیر اُس کے ہمراہ سوار ہیں۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کتر کر نکل جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اُس کو پہچان لیا اور فوراً گھوڑوں سے اتر کر شیخ کی طرف آئے اور نہایت تعظیم اور ادب سے شیخ کو سلام کیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسے دیے بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا حاضرین سے کہنے لگا کہ شمس الدین نے کبھی ہماری تعظیم بھی اس راہرو کی برابر نہیں کی یہ کون شخص ہے؟ جب دونوں بھائی شیخ سے مل کر واپس آئے تو ابا قاخان نے خواجہ شمس الدین سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا جس کی تم نے اس قدر تعظیم کی صاحب دیوان نے عرض کیا حضور یہ ہمارا شیخ ہے حضور نے سنا ہوگا شیخ سعدی اسی کا نام ہے اور اس کا کلام ایک عالم میں مشہور و معروف ہے۔ ابا قاخان نے کہا کہ اس سے ہم کو بھی ملو۔ چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ کی خدمت میں گئے اور اُس کو بادشاہ کے حضور میں لائے۔ کسی قدر صحبت کے بعد جب شیخ چلنے لگا تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو کچھ نصیحت کرو۔ شیخ نے کہا دنیا سے آخرت میں کوئی چیز ساتھ نہ جائے گی۔ مگر نیکی یا بدی۔ اب تم کو اختیار ہے جو منظور ہو سولے جاؤ۔ ابا قاخان نے کہا اس مضمون کو نظم کرو تو بہتر ہو۔ شیخ نے اُسی وقت یہ قطعہ نظم کر کے پڑھا:

شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد حلال باد خرابش کہ مزد چوپانی است
وگر نہ راعی خلق است۔ ز ہر مارش باد کہ ہر چہ میخورد از جزیہ مسلمانی است

ابا قاخان یہ قطعہ سن کر آبدیدہ ہو گیا اور کئی بار شیخ سے پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں۔ شیخ ہر بار یہی جواب دیتا تھا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلی بیت آپ کے مناسب حال ہے ورنہ دوسری بیت۔ ابا قاخان شیخ کی اس آزادانہ پند و موعظت سے نہایت خوش ہوا اور شیخ کو بہت عزت سے رخصت کیا۔

علی بن احمد جامع کلیات شیخ اس مقام پر لکھتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے مشائخ و علماء ایسی بیباکانہ نصیحت ایک بقال یا قصاب کو بھی نہیں کر سکتے اور اسی لیے زمانہ کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شیخ کے یہ کلمات اُس وقت اور بھی زیادہ قدر کے لائق ہو جاتے ہیں جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابا قاخان ہلاکو خان کا بیٹا اور چنگیز خان کا پوتا تھا جو اسلام اور

مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ اگرچہ ابا قحان کو مسلمانوں سے ویسی نفرت نہ تھی لیکن وہ بہر حال اسلام سے بیگانہ تھا اور ایک مسلمان شیخ یا واعظ کو اُس کے سامنے ایسی جرأت کرنی نہایت دشوار تھی ایسا کام اُسی شخص سے ہو سکتا ہے جس کو نہ جان کا خوف ہو نہ فائدہ کی اُمید جیسا کہ شیخ نے گلستان میں خود لکھا ہے ”نصیحت بادشاہان گفتن کے را مسلم است کہ بیم سر ندارد و اُمید زر“۔

سردار انلیانو جو بعد زوال خاندان اتابکیہ کے 667 ہجری میں سلطان ابا قحان کے حکم سے صوبہ فارس کی امارت اور حکومت پر مقرر ہوا تھا۔ ایک مغل صاحب ہیت و شان نہایت رعب داب والا اور اپنے مذہب میں نہایت پختہ تھا۔ اور ہمیشہ علمائے اسلام سے مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا۔ اور اُس کی ہیت سے بڑے بڑے اہل منصب لرزتے تھے۔ غالباً اُس نے شیخ سے درخواست کی تھی جس کے موافق شیخ نے نثر میں ایک پند نامہ جو اُس کے کلیات میں موجود ہے سردار مذکور کے نام لکھ کر بھیجا ہے۔ اس پند نامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بادشاہ، حاکم اور عامل شیخ کے کلام کی نہایت تعظیم کرتے تھے اور اُس کی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے تھے۔ سردار انلیانو کی شان میں شیخ نے قصائد بھی لکھے ہیں جو سراسر نصیحت و پند سے بھرے ہوئے ہیں یہاں تک کہ بعض قصائد دو تین مدحیہ اشعار کے سوا سراسر پند و موعظت ہی میں ختم کر دیے ہیں۔

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالک ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ہی تھی جیسی فارس اور عراق عجم میں۔ چنانچہ ایک دفعہ شیخ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحییٰ کی تربت پر محکف تھا۔ عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا مسجد میں آیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا اور کہا مجھ کو ایک سخت دشمن سے حملہ کا اندیشہ ہے آپ میرے لیے دعا کریں۔ شیخ نے کہا کمزور رعیت پر رحم کرنا کہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی اُس نے ایک لغو خیال پکا یا اور بیہودہ امید باندھی ہے۔

اگرچہ سلطنت عہد کے اعیان و ارکان میں شیخ کے معتقد اور ارادت مند بے شمار تھے لیکن خواجہ شمس الدین صاحب دیوان جس کے نام پر شیخ نے اپنے ایک مجموعہ نظم کا نام صاحبیہ رکھا ہے اور اُس کا بھائی علاء الدین جس نے سب سے اول مغول تاتاری فتوحات کے بیان

میں ”تاریخ جہان کشا“ لکھی ہے شیخ کے ساتھ ایک خاص قسم کا خلوص اور محبت یا عقیدت رکھتے تھے۔ اس مقام پر کچھ مختصر حال ان دونوں بھائیوں کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جوین جو کہ خراسان میں ایک سرسبز اور معمور خطہ تھا۔ یہ دونوں بھائی وہاں کے سندی سادات میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کے ذریعہ سے خانان تاتار کے عہد حکومت میں اپنا مرتبہ وزارت تک پہنچایا تھا۔ ہلاکو خان نے وزیر سیف الدین کی شہادت کے بعد اپنی وزارت بلا استقلال خواجہ شمس الدین جوینی کو عطا کی تھی اور اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین کو ملک بغداد اور اُس کے مضافات پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ہلاکو خان کے بعد ابا قاخان باپ کا جانشین ہوا تو اُس نے پہلے سے بھی شمس الدین کا زیادہ مرتبہ بڑھا دیا۔ اور سلطنت کی باگ بالکل اُس کے قبضہ میں دے دی۔ اب اُس نے مہمات سلطنت کے انصرام سپاہ و رعیت کی دلجوئی اور تمام ملکی خرابیوں کی اصلاح میں حد سے زیادہ کوشش کی۔ عراق، خراسان، بغداد، شام اور آرمینیا کے بادشاہ اور حاکم سب اُس کے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ اُس کی فیاضی اور سخاوت کی دھوم دور و نزدیک پہنچی تھی۔ باوجودیکہ اُس کا حکم کنارہ جیون سے شام اور ایشیائے کوچک تک نافذ اور جاری تھا۔ اس پر وہ علماء و فضلاء کے ساتھ کمال تواضع اور انکسار سے پیش آتا تھا اور اُن کے ساتھ حد سے زیادہ سلوک کرتا تھا۔ کبھی کسی پر اُس نے احسان نہیں جتایا ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کی تعظیم و مدارات اُن کے مرتبہ کے موافق کرتا تھا اور علاوہ کمالات علمی کے علم ادب اور شعر میں بھی اُس کو یدِ طولی حاصل تھا۔ زیادہ تر اُسی کی بدولت تاتاریوں میں دین اسلام شائع ہوا اور اُسی کے فیض صحبت سے ابا قاخان کے بھائی سلطان احمد¹ نے اپنے گھرانے میں سب سے اول اسلام قبول کیا آخر ارغون خان برادر سلطان احمد کے ہاتھ سے 663 ہجری میں شہید کیا گیا۔ شہادت سے چند ساعت پہلے اُس نے تھوڑی سی مہلت چاہی تھی اُس نازک وقت میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام ایک وصیت نامہ تحریر کیا اور ایک خط فضلاء تبریز کو لکھا جو کہ تاریخ و صاف میں بحکمہ منقول ہے اور جس سے اُس کا کمال استقلال اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے۔

1۔ سلطان احمد کا نام اسلام سے پہلے گودارتا تھا تاتاریوں میں اس سے پہلے صرف برکہ خان جوینی خان کا بیٹا اور چنگیز خان کا پوتا مسلمان ہوا تھا جس کے پاس خوارزم و دشت قباچ اور روس وغیرہ کی حکومت تھی۔

اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین جوینی نے بغداد کی حکومت کے زمانہ میں اُس اُجڑے اور ویران شہر کو جو کہ ہلاکوخان کے ظلم و بیداد سے بالکل پامال ہو گیا تھا چند روز میں اپنے عدل اور شفقت اور دلجوئی رعایا سے از سر نو معمور کر دیا۔ نجف اشرف میں نہر کھدوائی جس میں ایک لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہوا اور فرات کا پانی کوفہ کی مسجد میں لے گیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ جو کام بڑے بڑے خلیفہ اور بادشاہوں سے نہ ہو سکے تھے وہ اس فیاض اور دانشمند وزیر کی کوشش سے ظہور میں آئے تاریخ جہان کشا جو اُس نے تاتاریوں کی فتوحات کے بیان میں لکھی ہے وہ اُن تمام تاریخوں کا ماخذ ہے جو اس باب میں لکھی گئی ہیں۔

الغرض یہ دونوں بھائی جو دنیوی جاہ و اقتدار کے علاوہ کمالات علمی میں بھی امتیاز رکھتے تھے اور نیک سیرتی اور حسن اخلاق کے لحاظ سے بے مثل تھے۔ شیخ سعدی کے ساتھ اُن کو حد سے زیادہ خلوص اور اعتقاد تھا اور شیخ کو بھی جیسا کہ اُس کے قصائد و قطعات اور دیگر تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے ان دونوں سے انتہا درجہ کی محبت اور الفت تھی۔ ظاہرِ اجب سے شیخ نے سر ترک کر کے شیراز میں اقامت اختیار کی تھی اُس کے تمام اخراجات اور اُس کی خانقاہ کے مصارف کے متکفل خواجہ شمس الدین اور خواجہ علاء الدین تھے۔ ایک بار خواجہ شمس الدین نے پانچ سو دینار بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دار السلطنت تبریز سے شیخ کی خدمت میں بھیجے۔ راہ میں غلام نے شیخ کی معمولی اغماض اور چشم پوشی کے بھرد سے پر اُس میں سے ڈیڑھ سو دینار نکال لیے اور ساڑھے تین سو شیخ کے حوالے کیے۔ شیخ نے دیکھا کہ صاحب دیوان کے خط میں پانچ سو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیے ہیں اُس کی رسید میں یہ قطعہ لکھ بھیجا:

خواجہ تشریف فرستادی و مال مالت افزون باد و نصمت پائمال
ہر بدیناریت سالے عمر باد تا بمائی سید و پناہ سال
ترجمہ: تم نے مجھ کو عزت دی اور نقدی بھیجی۔ تمہاری دولت زیادہ اور تمہارے دشمن
پائمال ہوں۔ تمہاری عمر فی دینار ایک برس کے حساب سے ہو جیو تا کہ تم ساڑھے تین سو
برس دنیا میں رہو۔

صاحب دیوان نے یہ مضمون دریافت کر کے غلام کو بہت زجر و توبخ کی اور رقم کی بابت تدارک مافات کر کے شیخ سے معافی¹ چاہی۔ اس قسم کے مزاح آمیز اشعار اور بھی کئی موقعوں پر شیخ نے صاحب دیوان کو لکھے ہیں ایک بار اُس نے اپنی نظم دینر کا مجموعہ خواجہ کو حسب الطلب بھیجا تھا۔ جب ایک مدت تک وہاں سے رسید نہ آئی تو اُس کے تقاضے کے لیے یہ قطعہ لکھ بھیجا:

قطعہ

سفینہ حکمیات و نظم و نثر لطیف کہ بارگاہِ ملوک و صدور را شاید
بصدر صاحب صاحبقران فرستادم مگر بعین عنایت قبول فرماید
سفینہ رفت و ندانم رسید یا نرسید بدان دلیل کہ آئندہ دیر می آید
پارسائے ازمین حال مشورت بردم مگر ز خاطر من بند بستہ بکشاید
چہ گفت۔ گفت ندانی کہ خواجہ دریابست نہ ہر سفینہ زود یا درست باز آید
ایک بار خواجہ علاء الدین نے جلال الدین ختنی کو جو کہ شیراز میں کسی جلیل القدر منصب پر مامور تھا تہریر سے یہ حکم بھیجا کہ اس قدر دینار شیخ کی خدمت میں بھیج دو مگر اُس وقت جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے وہ رقم شیخ کے پاس نہ پہنچی جب شیخ کو اس حال کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ہنسی سے خواجہ علاء الدین کو یہ قطعہ لکھ بھیجا:

قطعہ

پیام صاحب دیوان علاء دولت و دین کہ دین بدولت ایام او بھی نازد

1۔ برمدق بخارائی جو ایک زبردست شاعر ہے اُس کو بھی یہ اتفاق پیش آیا ہے۔ بادشاہ نے اُس کو پانچ سو تومان انعام میں بھیجے تھے مگر اُس کو دو سو پہنچے اُس نے یہ قطعہ بادشاہ کو لکھ بھیجا۔ قطعہ

شاہ دشمن گداز دوست نواز آن جہا نگیر کو جهان دار است بش یوز آلتون کرم نمود بمن لطف سلطان ہندہ بسیار است
رمداز جملہ غائب است و کنون در بر آتم دو صد پدیدار است یا مگر من غلط شنودتم یا کہ پروانہ جی طلبگار است
یا مگر در عبادت ترکی بش یوز آلتون دوست دینار است

مگر اس قطعہ میں جیسا کہ ظاہر ہے شیخ کے قطعہ کی سی شوخی اور لطافت نہیں ہے۔ بش یوز آلتون کو بش یزالتن پڑھنا چاہیے۔ یہ ترکی الفاظ ہیں جن کا ترجمہ پانسو تومان ہے۔

رسید و پایہ حرمت فزود سعدی را بے نماںد کہ سر بر فلک بر افرازد
 مثال داد کہ صدر حقن جلال الدین قبول حضرت اورا تہدے سازد
 و لیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود چنانکہ بر ہمہ ابتائے دہر می تازد
 جلال زندہ نخواہد شدن درین دنیا کہ بندگان خداوندگار بنوازد
 مع بریدم ازو درسرائے عقبے نیز کہ از مظالم مردم بمن نہ پردازد
 ترجمہ: صاحب دیوان علاء الدین جس کے عہد دولت پر دین کوتاہ ہے اُس کی تحریر بچنی
 اور سعدی کو عزت بخشی۔ قریب تھا کہ اُس کا سر آسمان تک پہنچ جائے۔ اُس میں حکم تھا کہ
 امیر جلال الدین اُس کے فرمان کی تعمیل کرے مگر اُس پر لشکر اجل کی چڑھائی ہو چکی تھی
 جیسی کہ سب پر ہوا کرتی ہے۔ اب جلال الدین دنیا میں تو آنے والا ہے نہیں کہ خدا کے
 بندوں کی خبر لے۔ میں نے آخرت میں بھی اُس سے امید قطع کی کیونکہ وہاں لوگوں کے
 استغاثے اُس کو میری طرف کا ہے کو متوجہ ہونے دیں گے۔

خولجہ علاء الدین نے فوراً اُس کی تلافی کی اور عذر چاہا۔ شیخ کی خانقاہ جہاں اب اُس
 کی قبر ہے یہ بھی صاحب دیوان کے روپیہ سے بنی تھی۔ اس کام کے لیے پچاس ہزار دینار
 اُس نے شیخ کو دیے تھے۔ شیخ نے ہر چند اُن کے لینے سے انکار کیا مگر صاحب دیوان نے بہ
 ہزار منت و سماجت اُس کو راضی کیا اور شیخ کی زندگی ہی میں اس رقم سے ایک عالیشان مدرسہ یا
 خانقاہ پہاڑ کے نیچے جو کہ گوشہ شمال و مغرب میں شہر سے ملا ہوا ہے بنوائی گئی اور شیخ آخر عمر تک
 وہیں عزلت نشیں رہا۔

شیخ سے اکثر اہل علم حقائق و معارف کے دقائق و غوامض پوچھتے تھے اور وہ ہر ایک
 کا جواب تحریر یا تقریر میں دیتا تھا۔ از انجملہ علی بن احمد نے ایک قطعہ مولانا سعد الدین کا جو کہ
 علم و فضل کے سوا شاعری میں بھی مطلق و ماہر تھا نقل کیا ہے جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ
 سالک کی رہنما عقل ہے یا عشق۔ چونکہ اس قطعہ سے اُس زمانہ کے علماء کی رائے شیخ کی
 نسبت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے اس لیے وہ قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قطعہ:

سالکِ راہ خدا پادشہ ملک خن اے ز الفاظ تو آفاق پُر از دُرِ تیم
 اختر سعدی و عالم ز فروغ تو منیر واضح عقلی و کیتی ز نظیر تو عقیم

پیش اشعار تو شعر دگران را چه محل
سحر بے وقع نماید بر اعجاز کلیم
بندہ را از تو سوالی است کہ توجیہ سوال
کند مردم پاکیزہ سیر جز بہ کریم
مرد را راہ بحق عقل نماید یا عشق
این در بستہ تو بکشائے کہ بایست عظیم
گر چہ این ہر دو بیک شخص نیایند فرد
در دماغ و دل بیدار تو ہستند مقیم
پایہ منصب ہر یک از کرم باز نہائی
تا ز الفاظ خوش تازہ شود جان سقیم
باد آسودہ و فارغ ز بد و نیک جہان
خاطر آئینہ کردار تو چون نفس حکیم
شیخ نے اُس کے جواب میں ایک طول طویل بحث نثر میں لکھی ہے جو اُس کے کلیات
میں موجود ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا وہ شیخ کا نہایت ادب اور تعظیم اور
اطاعت کرتا تھا۔ سردار اٹلیا نو کو وہ برابر قصائد اور پند نامہ وغیرہ میں اس طرح خطاب کرتا
ہے جیسے بڑے اور بزرگ چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں۔ اُس کے سوا ملک عادل شمس الدین جو کہ
غالباً اٹلیا نو کے بعد شیراز کا حاکم ہوا تھا وہ بھی حد سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزت کرتا تھا۔
ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں جو
زمین کے محصول میں زمینداروں سے وصول کی تھیں ہنری فروشوں کے ہاتھوں جبراً کسی وعدہ
پر مہنگے نرخ سے پہنچی شروع کیں اور بہت سے بوجھ شیخ کے بھائی کی دوکان پر بھی جو کہ خاص
بادشاہی ڈیوڑھی کے پاس بقالی کی دوکان کرتا تھا بھجوائے۔ شیخ اس زمانہ میں حضرت
ابو عبد اللہ¹ ابن خفیف کی خانقاہ میں مجاور تھا۔ اُس کو بھی اس واقعہ کی خبر پہنچی۔ اُس نے ملک
شمس الدین کو جو کہ اس حال سے بے خبر تھا ایک قطعہ لکھ بھیجا جس میں اہل فوج کی شکایت اور
اپنے بھائی کی دوکانداری اور بے نوائی کا حال لکھا تھا۔ شمس الدین نے فوراً اُس کا تدارک کیا
اور خود شیخ کے پاس آیا اور معافی چاہی اور ہزار درم پیش کر کے کہا کہ یہ حقیر رقم آپ کے بھائی
کے خرچ کے لیے ہے اُس کو قبول کیجیے۔ شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی۔

1۔ یہ بزرگوار چوتھی صدی ہجری کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں جن کی نسبت خواجہ عبد اللہ انصاری نے لکھا ہے کہ

حقائق و معارف میں کسی کی تصنیفات ابن خفیف کی برابر نہیں ہیں۔

شیخ کی وفات¹ شیراز میں جب کہ اتابکان فارس کے خاندان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ولایت فارس خانان تاتاری حکومت میں آگئی تھی 691 ہجری میں واقع ہوئی ہے۔ کسی شاعر نے اُس کے مرنے کی تاریخ اس طرح کہی ہے:

دُر بحر معارف شیخ سعدی کہ در دریائے معنی بود غواص
مہ شوال روز جمعہ روحش بدان درگاہ رفت از روی اخلاص
یکے پرسید سالہا فوت گفتم ز خاصان بود ازان تاریخ شد خاص

691ھ

شیخ کی عمر کسی نے ایک سو دو برس کی اور کسی نے ایک سو دس برس اور اکثر نے ایک سو بیس برس کی لکھی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی پچھلا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شیخ جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے جوانی کے زمانہ میں شیراز سے باہر گیا اور بغداد میں اُس نے مدتوں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کیا ہے۔ امام ابن جوزی کی وفات 597ھ میں ہو چکی تھی۔ اور شیخ کی وفات اُس سے 94 برس بعد واقع ہوئی پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو دو برس کی سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کر چکا تھا اور اگر ایک سو دس برس کی عمر قرار دی جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ سترہ برس کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تھا اور شیراز سے بچپن ہی کے زمانہ میں نکل گیا تھا۔ پس جس طرح پہلی بات خلاف قیاس ہے اُسی طرح دوسری بات خلاف واقع ہے۔

سرگورادسلی نے انگلستان کے ایک سیاح ولیم فرنیکلن کے سفرنامہ سے جو کہ 1786ء میں فارس گیا تھا شیخ کے مدفن کا حال اس طرح لکھا ہے کہ ”شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک

1۔ سرگورادسلی نے اُس کی وفات اتابک محمد شاہ ابن مظفر مظفر شاہ بن سعد زنگی کے عہد میں لکھی ہے۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اتابک محمد شاہ 661ھ تخت پر بیٹھا تھا اور آٹھ مہینے سلطنت کر کے مر گیا۔ پھر اُس کا بھائی سلجوق شاہ تخت نشین ہوا اور 662ء میں قتل کیا گیا پھر سعد زنگی کی بیٹی آتش خاتون کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہوا اور 667ھ میں اُس کو معزول کر کے سلطان ابا قاسم خان نے سردار انلیانو کو جو کہ شیخ کا مددگار ہے حاکم فارس مقرر کیا۔ اب آگے کوئی تنفس اتابکان فارس کے خاندان کا حکمران نہیں ہوا۔ پس شیخ کی وفات جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا خاندان اتابک کے زوال سے چوبیس برس بعد اور اتابک محمد شاہ کے عہد سے تیس برس بعد واقع ہوئی ہے۔

میل جانب شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ عمارت اُس کی بہت بڑی اور مربع ہے اور قبر عقیں بنی ہوئی ہے۔ جس کا طول چھ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ ہے۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عبارت قدیم نسخ خط میں کندہ ہے جس میں شیخ کا اور اُس کی تصنیفات کا حال درج ہے۔ قبر ایک سیاہ رنگ کے چوبی قبر پوش سے جس پر سنہری کام ہو رہا ہے ڈھکی رہتی ہے اور اُس پر شیخ ہی کا ایک شعر خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ جب اس قبر پوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھائی دیتا ہے۔ اکثر اہل اسلام جو اطراف و جوانب سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور زائرین کے مطالعہ کے لیے ایک نسخہ شیخ کے کلیات کا نہایت خوشخط لکھا ہوا مزار پر رکھا رہتا ہے۔ مقبرہ کی دیواروں پر بہت سے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں جو لوگ دور دست مقامات سے وہاں زیارت کو آئے ہیں یہ اشعار انھوں نے لکھے ہیں۔ شیخ کے مقبرہ کی عمارت اب روز بروز گرتی جاتی ہے اور اگر اب اس کی خبر جلد نہ لی گئی تو بالکل کھنڈر ہو جائے گی۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ زمانہ کا عجیب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اُس کی مرمت کرانے کا خیال نہیں۔ اس مقبرہ کے متصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں جنھوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے۔ اس کے بعد سرگور اوکلی صاحب لکھتے ہیں کہ 1811ء کے شروع میں جب کہ میں جارج سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے بعنوان سفارت فتح علی شاہ قاجار کے پاس پیغام لے کر طہران کو جاتا تھا اُس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا۔ جب تک میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا۔ مسافر فرنگیوں کے لکھنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جا کر ہوتی ہے۔ اُس کی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہو گئی ہے اور تمام عمارت عنقریب منہدم ہوا چاہتی ہے۔ باغ اور درخت جو زمانہ سابق میں وہاں تھے اُن کا اب نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جائے تو اس مقبرہ کی مرمت بخوبی ہو سکتی ہے اور میرے حسن عقیدت نے جو کہ میں شیخ اور اُس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا مجھ کو آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ صرف کر کے شیخ کے مقبرہ کی مرمت کرا دوں۔ مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اُس وقت فارس کا گورنر تھا اُس نے مجھ کو اس ارادہ سے باز رکھا اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ میں اپنے روپیہ سے مزار کی مرمت کرا دوں گا آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ میں شیخ

کے مزار کی مرمت اُسی خوبی اور اسلوب اور عمدگی سے کراؤں گا جیسے کریم خان زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔

نہایت تاسف کا مقام ہے کہ عنقریب وہاں کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطہ ایران کا فخر جو ہدوتقویٰ اور ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے۔

سبحان اللہ کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مذہب زمین کے اُس کنارہ کا رہنے والا جہاں دنیا کی آبادی ختم ہوتی ہے باوجود اختلاف مذہب، اختلاف قوم اور اختلاف ملک کے ایک مسلمان مصنف کی ایسی قدر کرے کہ عالم سفر میں اُس کے مقبرہ کی مرمت کرانے پر آمادہ ہو اور اپنے پاس سے روپیہ خرچ کرنے کو موجود ہو۔ اور ایک مسلمان شاہزادہ سے باوجود اتحاد زبان، اتحاد مذہب، اتحاد قوم و ملک کے ایسی بے قدری اور بے اعتنائی ظہور میں آئے۔

﴿فاعتبروا یا اولی الابصار﴾

دوسرا باب

شیخ کی تصنیفات

شیخ کی شاعری کی شہرت اُس کی زندگی میں

شیخ کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اُس کی زندگی ہی میں تمام ایران، ترکستان، تاتار اور ہندستان میں اس قدر پھیل گیا تھا کہ اُس زمانے کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد اُس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ خود شیخ بھی گلستان کے دیباچہ میں کہتا ہے ”ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عوام افتادہ وصیت بخشش کہ در بسیط زمین رفتہ“ شیراز اور کاشغر میں کچھ کم 16 سو میل کا فاصلہ ہے پہلے اس سے کہ شیخ کاشغر میں پہنچے وہاں کے چھوٹے بڑے اُس کے کمالات سے واقف تھے۔

جس زمانے میں شیخ کاشغر پہنچا ہے۔ غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ چنگیز خان چینی تاتار کو خوارزمیوں سے فتح کر چکا ہے اور سلطان محمد خوارزم کے ساتھ چند روز کے لیے اُس کی صلح ہو گئی ہے۔ جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وہاں ایک طالب علم مقدمہ زنجیری¹ ہاتھ میں لیے زبان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ”ضرب زینہ عمرو“ شیخ اُس سے ٹہل کی باتیں کرنے لگا اور کہا کیوں صاحب خوارزم و خطا میں صلح ہو گئی مگر زید اور عمرو کی خصومت بدستور چلی جاتی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ فرمایا خاک پاک شیراز۔ اُس نے کہا کچھ سعدی کا کلام یاد ہے؟ شیخ نے بطریق مزاح اُسی وقت دو عربی شعر کہہ کر پڑھے۔ اُس نے کسی قدر تامل کے بعد کہا سعدی کا زیادہ تر کلام فارسی ہے اگر کچھ اُس میں سے یاد ہو تو پڑھیے۔ آپ نے ویسے ہی دو فارسی شعر پڑھے جن میں سے ایک یہ ہے:

1۔ علامہ جلال اللہ زنجیری صاحب تفسیر کشاف نے عربی زبان کی نحو میں ایک مختصر متن لکھا ہے اُس کا نام مقدمہ

شعر

اے دل عشاق بدام تو صید ما تو مشغول و تو با عمر و زید
 صبح کو جب شیخ نے کاشغر سے چلنے کا ارادہ کیا کسی نے اس طالب علم سے کہہ دیا کہ
 سعدی یہی شخص ہے۔ وہ بھاگا ہوا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا کہ پہلے سے آپ
 نے اپنا نام نہ بتایا کہ میں آپ کی خدمت گزاری سے سعادت حاصل کرتا۔ اگر اب بھی چند
 روز شہر میں چل کر قیام کیجیے تو ہم لوگ خدمت گزاری سے مستفید ہوں اس کے جواب میں
 آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

اشعار

بزرگے دیدم اندر کو ہمارے قناعت کردہ از دنیا بہ غارے
 چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی کہ بارے بند از دل بر کشائی
 بگفت آنجا پر یو دیان نغزند چو گل بسیار شد پیلان بلغزند

اسی طرح ملتان سے جو کہ شیراز سے چودہ سو میل ہے دو بار خان شہید سلطان محمد قان
 نے شیخ کی شہرت سن کر اُس کو وطن سے بلایا مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آسکا۔
 تبریز کے حمام میں جو شیخ اور مشہور شاعر ہمام¹ تبریزی کی نوک جھوک ہوئی ہے وہ
 نہایت مشہور قصہ ہے۔ جب تک ہمام نے یہ نہ جانا کہ یہ شخص سعدی ہے تب تک اُس سے
 چھیڑ چھاؤ کرتا رہا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ سعدی شیرازی ہے فوراً نہایت شرمندگی سے
 عذر معذرت کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور جب تک شیخ تبریز میں رہا کمال تعظیم اور ادب
 سے اس کی مہمانداری کی۔

سرگروا سلی نے کتاب مجالس العشاق سے ایک حکایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے
 کہ حکیم نزاری قہستانی (جو کہ خراسان کا ایک مشہور شاعر اور حکیمانہ مزاج آدمی تھا اور اسماعیلی
 مذہب رکھتا تھا) شیراز کے حمام میں شیخ سے ایک اجنبی صورت میں ملا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص
 خراسان کا رہنے والا ہے شیخ نے پوچھا کہ سعدی کو کوئی خراسان میں جانتا ہے؟ کہا اُس کا کلام

1۔ خواجہ ہمام الدین باوجود نسبت باطنی اور کمالات علمی کے تبریز کے امرا میں سے تھا اور شاعری میں تمام

معاصرین اُس کو مانتے تھے۔ محقق طوسی سے تحصیل علم کی تھی اور 713ھ میں وفات پائی۔

وہاں عموماً زبان زد خلاق ہے۔ اور پھر شیخ کی درخواست سے اُس کے چند اشعار پڑھے جن کو سن کر شیخ محفوظ ہوا اور سمجھا کہ یہ شخص شعر کا عمدہ مذاق رکھتا ہے۔ آخر دونوں پر ایک دوسرے کی حقیقت کھل گئی۔ شیخ نزاری کو اپنے مکان پر لے گیا۔ اور بہت دن تک اُس کو جانے نہ دیا اور بہت خوشی سے دل کھول کر اُس کی مہمانداری کی۔ حکیم نزاری نے وہاں سے رخصت ہوتے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ اگر ہمارا میزبان کبھی خراسان میں آیا تو ہم اُس کو دکھائیں گے کہ مہمانوں کی تواضع اور مدارات کس طرح کیا کرتے ہیں۔ یہ جملہ شیخ کے کان تک بھی پہنچ گیا۔ اُس کو کمال افسوس ہوا اور یہ سمجھا کہ حکیم نے ہماری مہمانداری میں شاید کوئی قصور دیکھا۔ حسن اتفاق سے شیخ کا گزر رقبستان میں ہوا اور حکیم نزاری سے ملاقات ہوئی۔ حکیم بہت محبت اور اخلاق سے پیش آیا مگر دعوت میں کچھ زیادہ تکلف نہیں کیا۔ پہلے روز جو کھانا دسترخوان پر آیا وہ محض رسی اور سیدھا سادہ تھا۔ دوسرے وقت ایک بھنے ہوئے میٹر کے سوا اور کچھ نہ تھا تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلّا ہوا پارچہ اور خشکا تھا۔ چلتے وقت حکیم نے شیخ سے معافی چاہی اور کہا کہ جس طرح آپ نے میری ضیافت میں تکلفات کیے تھے اُس طرح سے مہمان آخر کو باخاطر ہو جاتا ہے لیکن ہمارا طریقہ ایسا نہیں ہے شیخ کو اُس جملہ کا مطلب جو نزاری نے شیراز سے چلتے وقت کہا تھا اب معلوم ہوا۔

اس حکایت سے شیخ کی شہرت اور بلند آوازگی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی تعصبات سے مبرا تھا۔ فرقہ اسمعیلیہ کے لوگ اُس زمانے میں عموماً ملحد اور بے دین سمجھے جاتے تھے اور کوئی فرقہ مسلمانوں میں کے نزدیک اسمعیلیوں سے زیادہ مبغوض اور مردود نہ تھا پس شیخ کی کمال بے تعصبی تھی کہ اُس نے ہمارے عہد کے مولویوں اور واعظوں کے برخلاف ایک غریب اسمعیلی کی اپنے وطن میں اس قدر خاطر اور مدارات کی اور خراسان میں خود اُس سے جا کر ملا اور اُس کا مہمان رہا۔ الغرض یہ حال شیخ کی شہرت کا خود اُس کے زمانے میں تھا اور اُس کے مرنے کے بعد جو عام قبولیت اُس کے کلام نے حاصل کی اُس کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے اُن کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے جس میں فردوسی کو مثنوی کا۔ انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا پیہر قرار دیا ہے اور وہ قطعہ یہ ہے:

قطعہ

در شعر سہ کس پیہر اند
ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

نیز مولانا جامی نے نجات الانس میں امیر خسرو دہلوی کی کثرت تصانیف اور جامعیت کے ذکر کے بعد شیخ کو باعتبار مقبولیت کلام کے امیر پر اس پیرایہ میں ترجیح دی ہے کہ امیر نے بھی حضری ملاقات کے وقت یہ درخواست کی تھی کہ اپنا آب دہن اُس کے منہ میں ڈالے حضرت خضر نے فرمایا کہ یہ دولت سعدی کے نصیب کی تھی۔

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی اور ہام تبریزی کو اپنی مثنوی نہ سپہر میں غزل کا استاد مانا ہے لیکن دیگر اصنافِ سخن میں کنایا اپنے کو ترجیح دی ہے۔ مگر ایک اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر خود فخر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

شعر

خسرو مرست اندر ساغر معنی بر بخت
شیرہ از میخانہ مستی کہ در شیراز بود
حضرت امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس کے زمانے کے اہل مذاق سعدی ہندستان کہتے تھے شیخ کے تتبع پر افتخار کیا ہے وہ کہتے ہیں:

شعر

حسن گلے ز گلستان سعدی آورده است
کہ اہل معنی گلچین ازین گلستان اند

خواجہ مجد الدین ہنگر جو کہ شیخ کا جلیل القدر معاصر ہے اُس سے چار نامی گرامی فاضلوں نے جن میں سے دو شخص علاوہ علم و فضل کے ہلاکو خان کے رکن سلطنت بھی تھے یعنی خواجہ شمس الدین صاحب دیوان، امیر معین الدین پروانہ حاکم روم، ملک افتخار الدین کرمانی اور ملا نور الدین صدری نے با اتفاق ہم دگر ایک قطعہ مرتب کر کے مجد ہنگر کے پاس بھیجا تھا۔ جس میں امامی ہرودی اور سعدی شیرازی کے کلام پر محاکمہ کی درخواست کی گئی تھی۔ اُس کے جواب میں مجد ہنگر نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی۔

رباعی

ماگر چہ ۱ بہ نطق طوطی خوش نسیم بر شکر گفتہ ہائے سعدی مکسیم
در شیوہ شاعری بہ اجماع ام ہرگز من و سعدی بہ امامی نہ رسیم
اس رباعی میں اگرچہ ہنگر نے شیخ کو اپنے سے بہتر بتایا ہے مگر امامی کو اپنے اور شیخ دونوں پر ترجیح دی ہے۔

حاجی لطف علی خان آذر نے مذکورہ بالا حکایت پر جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظہ کے قابل ہے وہ لکھتا ہے کہ بعض مدعیان شعر نے مجد الدین ہنگر سے کہ عنایت الہی پستی طبع میں آج اُن کا کوئی نظیر نہیں ہے سعدی اور امامی کی بابت محاکمہ چاہا تھا انھوں نے جواب میں یہ رباعی تحریر فرمائی۔ میں نے اس رباعی کو پڑھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ہمارے زمانے میں ایسا اشتباہ کسی کو نہیں ہے (جیسا کہ محاکمہ چاہنے والوں کو تھا) اہل مذاق جانتے ہیں کہ ہنگر کی تحقیق کیسی مصححینڈی ہے۔ ہاں انھوں نے اپنی نسبت بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ”میں امامی کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ بیشک امامی کا مرتبہ جناب صاحب رباعی سے بہت بالاتر ہے لیکن کسی طرح اُس کو شیخ بزرگوار سے نسبت نہیں ہے بلکہ تین مخصوں² کے سوا اور کسی کی پخال نہیں جو شیخ کی مساوات کا دم مار سکے۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جیسا ہمارا زمانہ دانشمندوں پر سخت گزرتا ہے ایسا زمانہ پہلے سخوروں پر بھی گزرا ہے یا نہیں۔ جب یہ حکایت میری نظر سے گزری تو مجھ کو صبر آگیا۔“

1۔ شیخ نے بھی اس رباعی کو سن کر ایک رباعی لکھی ہے جو اس کے کلیات میں موجود ہے یعنی ”ہر کس کہ ہمارا مہامی
نزد از بخت سیاہ و بدکلامی نزدستد ہنگر کہ ہر خود نہ کردہ است نماز شک نیست کہ ہرگز یہ امامی نزدستد۔“

2۔ شاید تین مخصوں سے مراد فردوسی، انوری اور نظامی ہیں۔

حاجی موصوف نے اس مقام پر مجد ہنگر کی شان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے:

قطعہ

یکے گفت - امامی ہری را ز سعدی فزون یافتہ مجد ہنگر
درین ماجرا چست راے تو - گفتم ستمگر بود مجد ہنگر ستمگر

ہمارے نزدیک اگر مجد ہنگر اُس عصر میں جس میں سعدی اور امامی گزر رہے ہیں نہ ہوتا بلکہ سو پچاس برس بعد پیدا ہوتا تو اُس کو بھی شیخ اور امامی کے رتبے میں ہرگز یہ اشتباہ نہ ہوتا معاشرت نے لوگوں کے حالات پر اکثر ایسے پردے ڈالے ہیں مگر جس قدر اُن کا زمانہ گزرتا گیا اُسی قدر وہ پردے مرتفع ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ جوتی بات تھی وہ ظاہر ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک زمانہ میں دو اہل کمال ہوتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ایک ایک گروہ متعصبین کا کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ ہر شخص کے کچھ عزیز اور دوست اور کچھ اُن دوستوں کے دوست اور اسی طرح کچھ مخالف اور اُن مخالفوں کے دوست اور یگانے ضرور ہوتے ہیں اور اس طرح بڑھتے بڑھتے دو بڑے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور اُن کے ساتھ کسی کو لاگ یا لاگ و باقی نہیں رہتا تو جو ٹھیک بات ہوتی ہے وہ بغیر بحث و حجت کے خود بخود دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ شیخ اور امامی کے عہد میں یہ کس کو معلوم تھا کہ عنقریب ایک کا کلام اطرافِ عالم میں پھیل جائے گا اور دوسرے کا نام صرف کتابوں میں لکھا رہ جائے گا۔

کلام شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں اکثر یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ مشائخ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے۔ ایک رات اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے ہیں۔ اُن بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہا سعدی شیرازی نے ایک بیت کہی ہے جو جناب الہی میں مقبول ہوئی یہ اس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے:

برگ درختان بزر در نظر ہوشیار ہر درتے دفتر بیت معرفت کردگار

جب وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے تو رات ہی کو شیخ کے عزت خانے پر یہ مژدہ سنانے کے لیے گئے۔ وہاں جا کر شیخ کو دیکھا کہ چراغ روشن کیے ہوئے جھوم جھوم کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں شاید اس حکایت کا مضمون بادی النظر میں مستبعد معلوم ہو۔ لیکن ہم کو اس میں

کوئی بات عقل یا نیچر کے خلاف نہیں معلوم ہوتی۔ خواب کا سچا ہونا اور ان میں معمولی باتوں کا غیر معمولی طور پر نظر آنا ایک ایسا مسلمہ امر ہے کہ آج کل کے فلسفی بھی اُس کا انکار نہیں کر سکتے اس کے علاوہ ہم اس حکایت سے ہر حال میں یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ شیخ کے کلام کی مقبولیت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ معمولی پیرائے اُس کے بیان کے لیے کافی نہ سمجھے جاتے تھے۔

اس حکایت کو اور زیادہ چکانے کے لیے شیخ ابو الفیض فیضی کے مخالفوں نے ایک اور دلچسپ مضمون تراشا ہے۔ یعنی یہ کہ فیضی نے نلد من کی توحید لکھتے وقت جب یہ شعر کہا:

شعر

در ہر بن موکہ می نمی گوش نوراہ فیض اوست در جوش

تو اُس نے بھی ویسے ہی صلی کی توقع میں جو شیخ سعدی کو ملا تھا آسمان کی طرف منہ کیا اتفاقاً ایک چیل نے اوپر سے پتھال کی جو فیضی کے منہ پر آ کر پڑی وہ بہت جھنجھلایا اور کہا: ”شعر فہمی عالم بالا معلوم شد“ ظاہر یہ مضمون عبدالقادر بدادونی کا جو کہ شیخ مبارک کے خاندان کا سخت دشمن ہے یا اُس کے کسی متبع کا گھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

جیمیز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ”سعدی کے کلام کی لطافت اور بذلہ سنجی روماء کے مشہور شاعر ہوریس کے کلام سے بہت ملتی ہے چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی اس لیے ظن غالب ہے کہ وہ ہوریس کے کلام سے مستفید ہوا ہوگا“ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے اور واقع میں شیخ کو لاطینی آتی تھی یا نہیں۔ ظاہر یہ ویسا ہی قیاس ہے جیسا کہ دہلی کی جامع مسجد اور آگرہ کے روضہ تاج گنج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں اٹلی کے کاریگروں نے بنائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو قوم نہایت ہستی کی حالت میں ہوتی ہے اگرچہ وہ کسی زمانہ میں کتنی ہی ترقی کر چکی ہو جس طرح اُس قوم کی موجودہ سلیس ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں حقیر اور ذلیل اور ہیچ و پوچ معلوم ہوتی ہیں اسی طرح اُن کے اسلاف کی عظمت اور برتری کا بھی بہت کم یقین آتا ہے۔ اور اگر اُن کی کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا تو اُس کو مجبوراً کسی اور کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے۔

سروہیم جونس جو کہ مشرقی زبانوں کا نہایت مشہور عالم ہے اُس نے جو شیخ اور اُس کے

کلام کی نسبت لکھا ہے وہ سرگور اوہلی نے نقل کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ سعدی نے تیرہویں صدی ہجری میں جب کہ اتابکان فارس وہاں کے اہل کمال کو تقویت دے رہے تھے اپنے جوہر دکھا نے شروع کیے تھے۔ حالانکہ اُس کی تقریباً تمام زندگی سفر میں گزری تھی باوجود اس کے کہ کسی ایسے شخص نے بھی جس کو عمر بھر اطمینان اور فرصت حاصل رہی ہو اپنی عقل اور محنت کا نتیجہ شیخ سے بہتر نہیں چھوڑا۔

انگلستان کے بعض اور مصنفوں نے اس کو مشرقی ہلکسیر کہا ہے۔ اگرچہ یہ تشبیہ اُن مشرقی شاعروں کی نظر میں جو ہلکسیر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ انگریز ہلکسیر کو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں تو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ سعدی کو مشرق کا ہلکسیر کہتے ہیں انھوں نے اُس کو کس درجہ کا شاعر تسلیم کیا ہے۔

ہلکسیر کی شاعری اگرچہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دونوں کے کلام میں عموماً یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادت کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیان ہمیشہ سادہ صاف اور دل نشیں ہوتا ہے۔ اس کے سوا دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت اور پند پر رکھی ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ شیخ کھلم کھلا نصیحت کرتا ہے اور ہلکسیر کے پلے (یعنی نانک) سن کر کسی شخص کو یہ خیال نہیں گزرتا کہ یہ میرے ہم جنسوں کے عیب بیان ہو رہے ہیں یا کسی کو نصیحت کی جاتی ہے مگر اُس کا بیان اندر ہی اندر اپنا کام کرتا ہے بلکہ یہ گہیتی منتر صریح نصیحت و پند سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ نیز دونوں کا کلام مقبول اور دل نشیں ہونے میں ایک دوسرے سے نہایت مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح ہلکسیر کے صدہا اقوال انگریزی میں ضرب المثل ہو گئے ہیں اسی طرح شیخ کی گلستان اور بوستان کے صدہا فقرے اور شعر اور مصرعے فارسی اور اردو میں ضرب المثل ہیں۔ اور اس سے دونوں کے کلام کی کمال خوبی اور حُسن اور یہ بات کہ انھوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر تسلط کیا ہے اور اُن کا کلام کس قدر انسان کی حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق واقع ہوا ہے ثابت ہوتی ہے اگرچہ اس کا زیادہ تر سبب یہ بھی ہے کہ ایشیا

میں جس قدر گلستان اور بوستان کی تعلیم و تعلم کا چرچا ہے ایسا کسی اور کتاب کا نہیں اور اسی طرح یورپ میں جس قدر ہکسیر کا کلام دائر و سائر ہے ایسا کسی اور شاعر کا کلام نہیں۔ پس ضرور ہے کہ دونوں کے اقوال سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوں لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی کلام فی نفسہ مقبول اور دل نشیں ہونے کے قابل نہ ہو کسی طرح ممکن نہیں کہ اس طرح تمام ملک میں مشہور اور متداول ہو سکے۔

کلیاتِ شیخ

شیخ کا تمام کلام نظم، نثر، فارسی اور عربی جو اُس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی بن احمد ابن ابی بکر نے شیخ کی وفات سے بیالیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے حسب تفصیل ذیل ہے۔

(1) نثر میں چند مختصر رسالے (جس میں سلوک اور تصوف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکایتیں اور ملوک و حکام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) (2) گلستان (3) بوستان (4) پند نامہ (جس کو عرف عام میں کریما کہتے ہیں) (5) قصائد فارسی (جن میں مرعبے، ملمعات، مثلثات اور ترجعات بھی شامل ہیں) (6) قصائد عربیہ (7) غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بہ طیبات (8) دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع (9) تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم (10) غزلیات قدیم جو غالباً عنفوانِ شباب کی لکھی ہوئی ہیں (11) مجموعہ موسوم بہ صاحبیہ جس میں شیخ نے قطعات، مثنویات، رباعیات اور مفردات کو خوبہ نفس الدین صاحب دیوان کی فرمائش سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے (12) مطاببات و ہزلیات۔

ان تمام کتابوں اور سالوں میں سے مثنوی پند نامہ یعنی کریما کو بعض اہل مذاق شیخ کا کلام نہیں سمجھتے کیونکہ اول تو کلیات کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ مثنوی نہیں دیکھی گئی دوسرے شیخ کے عام کلام میں جو چٹنگی اور جزالت یا لفریبی اور جادو پایا جاتا ہے اُس سے یہ مثنوی معزا ہے مگر ہمارے نزدیک اس مثنوی کو شیخ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی استبعاد اور تردد کی بات نہیں ہے یہ سچ ہے کہ وہ بوستان اور شیخ کی عام نظم کے مقابلے میں نہایت کم وزن معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر کا حال بالکل اس شعر کا مصداق ہے:

شعر

گے بر طارم اعلیٰ نشینم گے بر پشتِ پائے خود نہ بنم

ایک ہی شاعر کا ایک کلام معجزہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہڈیاں اور ہڈی وہ خاصیت ہے جو خدا کے کلام کو بشر کے کلام سے جدا کرتی ہے کما قال اللہ تعالیٰ: لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا کلیات کے بعض قدیم نسخوں میں اس مثنوی کا نہ پایا جاتا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ شیخ کا کلام نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اُس نے اس کو بھی کلیات میں داخل کر دیا ہو اور اس سبب سے کلیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہو۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو کے کلیات میں اسی طرح نسخوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

بہر حال ہم جس طرح اس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں سمجھتے اسی طرح اس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے۔

اب ہم شیخ کی بعض تصنیفات پر جو زیادہ مشہور ہیں یا زیادہ لحاظ کے قابل ہیں متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہماری محدود واقفیت اور ناچیز رائے مساعدت کرے گی ہم اُن کی حقیقت ظاہر کرنے میں کوشش کریں گے ناظرین باتمکین سے یہ درخواست ہے کہ اگر کہیں ہماری رائے کی غلطی ظاہر ہو تو اُس کو متعصبانہ افراط و تفریط پر محمول نہ فرمائیں بلکہ اس کو ایک مقتضائے بشریت سمجھ کر اُسی قدر مواخذہ کے قابل ٹھہرائیں جس قدر کہ ایک غلط (مگر سچی رائے پر مواخذہ ہو سکتا ہے)۔

گلستان اور بوستان

اگرچہ ہر تصنیف و تالیف کی ماہیت اور اُن کے عیب و خوبیاں بیان کرنی عموماً مشکل ہیں لیکن جو کلام سب کے نزدیک مقبول ہو اور جس پر کسی نے خردہ گیری نہ کی ہو اُس پر ریو یو لکھنا اور اُس کی خوبی یا عیب بیان کرنا حد سے زیادہ مشکل ہے۔ جس طرح بدیہیات پر استدلال کرنا نہایت دشوار ہے۔ اسی طرح ایسے مقبول اور مسلم کتابوں کے محاسن بیان کرنے

مشکل ہیں اور اسی طرح ان پر کتبہ چینی کرنی اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہم پہلا آسان کام کسی قدر اپنے ذمہ لیتے ہیں اور دوسرے مشکل کام کو اپنے سے زیادہ دقیقہ شناس اور باریک بین لوگوں پر چھوڑتے ہیں۔

ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیے۔ ظاہر افارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں ان کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اور بڑھاپے تک مطالعہ کا شوق رہتا ہے لاکھوں استادوں نے انھیں پڑھایا۔ اور کروڑوں شاگردوں نے انھیں پڑھا ان کے بیشمار نسخے خوشنویسوں کے قلم سے لکھے گئے۔ اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ مشائخ اور علماء نے ان کی عزت کی۔ بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دستور العمل بنایا۔ فشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت اور بلاغت کے آگے سر جھکا یا اور ان کے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا ان کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول، فصاحت، بلاغت، تہذیب اخلاق، چند نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے *احدهما افضل من الآخر* لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستان کو بوستان پر ترجیح دی جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔

فارسی نظم میں بوستان کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستان سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں بلکہ مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے شاید اُس سے بھی بڑھ کر قبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہر کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اُس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستان کے برابر مقبول ہوئی ہو۔ سرگور اوہلی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل جٹیس نے لاطینی میں کیا تھا اُس نے مدتوں یورپ کے اہل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے۔

تذکرہ مجمع الفصحا جو کہ ابھی ایران میں تالیف ہوا ہے اُس میں یا کسی اور تذکرے میں لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں ایسی اور کوئی

کتاب نہیں ہوئی۔ شاہنامہ، مثنوی معنوی، گلستان اور دیوان حافظ۔

ہندستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں۔ جیسی ایران میں مگر سب کی شہرت اور قبولیت کے وجوہ مختلف ہیں۔ اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بے ساختگی میں چاروں کتابیں کم و بیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اُس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دل فریب چیز نہ ہو کیونکہ نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں جو تکلف اور قصع سے بالکل پاک ہیں ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ہماری رائے میں گلستان کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اس سبب سے مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ زمانے کے مذاق اور طبائع کے ساتھ بہت مناسب رکھتی تھیں۔ سب سے اول شاہنامہ پر غور کرو۔ قطع نظر اس سے کہ قدیم زمانے کے حالات اور گزشتہ قوموں اور بادشاہوں کے محاربات انسان کو ہمیشہ بالطبع مرغوب ہوتے ہیں۔ جس زمانہ میں کہ شاہنامہ لکھا گیا اُس وقت وسط ایشیا کے مسلمانوں کو فتوحات اور لشکر کشی و کشور کشائی کا شوق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اور شجاعت و بہادری کے مضمون اُن کو دل سے پسند آتے تھے۔ پس ایک رزمیہ نظم کا جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ہیں ایسے وقت میں لکھا جانا اُن کی حالت کے نہایت مناسب تھا۔ یہی سبب تھا کہ شاہنامہ ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کی صد ہا داستانیں کم و بیش لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھیں۔ اور آخر کو اُس کا یہاں تک رواج ہو گیا تھا کہ بادشاہوں کے ہاں شاہنامہ خواں نوکر رکھے جاتے تھے۔ اور قبوہ خانوں میں جا بجا گرمی صحبت کے لیے شاہنامہ پڑھا جاتا تھا۔ اس کے سوا ہزاروں عجیب و غریب قصے جیسے سمرغ کا زال کو پرورش کرنا۔ طہورث دیوبند کا دیود کا قید کرنا۔ جام جمشید کے کرشمے۔ رستم کا اپنے زور سے تنگ آکر اُس کو خدا کے پاس امانت رکھوانا اور پھر سہراب کی لڑائی میں واپس لے لینا۔ اُس کا سیکڑوں دیوؤں کو مارنا اور مغلوب کرنا۔ اُس کے رخش کا شیروں کو ہلاک کرنا دژ بہمن کا طلسم ٹوٹنا اور اسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل قصہ امیر حمزہ اور بوستان خیال کے اُس میں درج تھے جو تمام دنیا کے آدمیوں کو عموماً اور ایشیا والوں کو خصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے ہیں۔ ان باتوں نے شاہنامہ کو اور بھی زیادہ مقبول اور عام پسند کر دیا تھا۔

مولانا روم کی مثنوی اُس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب کہ ہمارے لٹریچر میں تصوف اور معرفت کا تسلط روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ شیخ محی الدین ابن العربی، شیخ صدر الدین قونوی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ علاء الدولہ سمنانی وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوف کی روح پھونک رہی تھیں شعر میں حقیقت اور معرفت کے مضامین تغزل کی نسبت زیادہ جی لہانے لگے تھے۔ شیخ اکبر اور ابن فارض کے دیوانوں کے سامنے متنبی اور ابوتام کی تشبیہیں بے مزہ معلوم ہونے لگی تھیں۔ حدیقہ اور منطق الطیر نے رودکی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرا دیا تھا۔ ایسے وقت میں مثنوی معنوی کا جو کہ سراسر تصوف اور حقائق و معارف سے بھری ہوئی ہے مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا جیسے غزنویہ اور سلاطیہ کے عہد میں شاہنامہ کا اور صفویہ کے عہد میں حملہ حیدری کا اس کے سوا مثنوی میں بھی صد با عیب و غریب قصے اور فوق العادہ نقلیں اور تمثیلیں جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں درج تھیں اور اُن میں شریعت اور طریقت کے اسرار بیان کیے گئے تھے۔ پس مثنوی میں شعر اور تصوف کے علاوہ قصہ کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی۔ یہی باعث ہے کہ مولانا روم کے حق میں ”نیست بینبر و لے دارد کتاب“ اور مثنوی کے حق میں ”ہست قرآن در زبان پہلوی“ کہا گیا ہے۔

خواجہ حافظ کے دیوان میں عشق و جوانی اور رندی اور شاہد بازی کے مضامین کے سوا جو کہ ہمیشہ سے دنیا میں مرغوب رہے ہیں اور انسان کے دل کو بزور اپنی طرف کھینچتے ہیں اور کوئی مضمون ہی نہ تھا۔ اور اس خیال نے کہ اُس میں عشق حقیقی کی واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرایہ میں ادا کی گئی ہیں اُس کو اور بھی زیادہ دلچسپ اور دلربا کر دیا تھا۔ پس ان تینوں کتابوں کا اس قدر مقبول ہونا کچھ زیادہ تعجب کی بات نہ تھی۔

گلستان میں ان وجوہ میں سے کوئی وجہ نہ تھی نہ اُس میں رزم تھی نہ عجیب و غریب افسانے تھے۔ نہ فوق العادہ قصے، نہ حقائق و معارف، نہ شریعت کے اسرار، نہ طریقت کے نکات، نہ غزل عاشقانہ، نہ قول عارفانہ بلکہ اُس کی بنیاد محض اخلاق پند و موعظت پر رکھی گئی تھی جس سے زیادہ کوئی پھیکا اور بے نمک مضمون خاص کر فارسی لٹریچر میں نہیں پایا جاتا۔ پند و موعظت جب تک قصہ یا ناکہ کے پیرایہ میں نہ ادا کی جائے اکثر مخاطب کی وحشت اور متغیر کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان کی طبیعت میں یہ بات و دلیت کی گئی ہے کہ وہ کھلی نصیحتوں سے متغیر اور چھپی نصیحتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ پس گلستان کا اس قدر مقبول ہونا سوا اس کے کہ

اُس کی فصاحت و بلاغت اور حسن بیان اور لطف ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور لا جواب تسلیم کیا جائے اور کسی وجہ پر محمول نہیں ہو سکتا۔

گلستان کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر زبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ خود شیخ ہی کے زمانہ میں گلستان کے اکثر قطعات و ابیات اس قدر مقبول اور زبانوں پر جاری ہو گئے تھے کہ اُس زمانہ کے فضلا اور ادبا اُس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کر کے اپنا زور طبع اور قدرت نظم دکھاتے تھے۔ چنانچہ ادیب نامہ دار فضل اللہ بن عبد اللہ شیرازی نے بھی جو کہ شیخ کے اخیر زمانہ میں تھا اپنی مشہور تاریخ و صاف میں گلستان کے دو قطعوں کا ترجمہ عربی میں نظم کیا ہے جو کہ مع اصل قطعات کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

قطعه سعدی

رَسید از دستِ محبوبے بدستم	گلے خوشبوئے در حمامِ روزے
کہ از بوئے دلاویز تو مستم	بدو گفتم کہ مشکِ یا عیبری
و لیکن مدتے با کلِ نشستم	بکھتا من گلے ناچیز بودم
و گر نہ من همان خاتم کہ ہستم	جمالِ ہمنشین در من اثر کرد

ترجمہ عربیہ

توصل من ایدی کریم الی یدی	اذا هو فی الحمام طین مُطِیْبٌ
فِی اَنی من رِیَاک سکران معتد	فَقُلْتُ لہ هل انت مشک و عنبر
فَجالستُ للورد الجنی بمعهد	اَجَابَ بِانی کنتُ طیناً مُذَلَّلاً
و الا انا الترابُ الذی کنتُ فی ید	فائثر فی خلقي کما مجالسی

قطعه سعدی

تا دلِ خویش نیاز دارد و درہم نشود	گر خردمند ز اجلاف جفائے بیند
قیمتِ سنگِ میفزاید و زر کم نشود	سنگِ بدگوہر اگر کاسہ زرین بشکست

ترجمہ عربیہ

إِنْ نَالَ نِلْدٌ مِنَ الْإِنْدَالِ مَنْقُصَةً حَاسِي لَهُ أَنْ يَلِيبَ النَّفْسَ بِالصَّخْرِ
فَالْتَبَرُ يَنْبَرُ إِذْ صَارَ مُنْكَسِرًا فَالْتَبَرُ يَنْبَرُ وَمَا يَزِدَادُ فِي الْحَجَرِ

پھر ایک مدت کے بعد تمام گلستان کا ترجمہ جیسا کہ مشہور ہے عربی زبان میں ہوا جو کئی صدیوں تک عرب، شام، روم اور مصر میں متداول رہا اور حال میں مصر کے ایک ادیب نے جس کا نام جبریل ہے۔ اُس کا ایک اور نہایت فصیح عربی ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں چھپوایا ہے اس کے سوا استنبول کی ترکی میں بھی اُس کے متعدد ترجمے کئے گئے ہیں۔ جن میں سب سے اخیر ترجمہ سلطان عبدالحمید خان کے بھائی اور ولی عہد رشاد پاشا نے حال ہی میں کیا ہے۔ یورپ میں گلستان اور بوستان کے جس قدر ترجمے ہوئے ہیں اُن کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم ہونی مشکل ہے۔ مگر انگلش انسائیکلو پیڈیا میں کسی قدر ترجموں اور ایڈیشنوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو 1852ء تک چھپے اور شائع ہوئے اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

گلستان کے ترجمے بوستان کی نسبت بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے جنس نے اصل گلستان مع لاطینی ترجمہ اور کسی قدر حواشی کے امسٹرڈم میں چھپوائی۔ پھر ڈورائر نے جو کہ فرانس کی طرف سے اسکندریہ میں کانسل تھا فرینچ میں اس کا ترجمہ کیا جو کہ 1634ء میں بمقام پیرس چھپا۔ اُس کے بعد اصل کتاب سے گارڈین نے 1789ء میں اور سیمالٹ نے 1834ء میں ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے بھی فرینچ میں ہوئے تھے۔ جرمن زبان میں اولی ایریس کا ترجمہ زیادہ مشہور ہے وہ اُس کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس ترجمہ میں ایران کے ایک فاضل سے مدد لی گئی ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میرے ترجمے سے پہلے ڈورائر کے فرینچ ترجمہ سے ایک اور ترجمہ جرمن میں ہو چکا تھا۔ اولی ایریس کا ترجمہ نہایت ذی وقعت ہے اور اس میں جو تصویریں چھاپی گئی ہیں وہ بہت ہی عمدہ ہیں۔ یہ ترجمہ اول 1654ء میں بمقام سلینرگ چھپا تھا اور اسی سال جرمن سے ڈچ زبان میں ترجمہ ہو کر امسٹرڈم میں چھپا۔ اولی ایریس نے بوستان کا بھی ترجمہ جرمن میں کیا ہے۔ حال میں گلستان کا ایک اور ترجمہ کے۔ ایچ گراف نے جرمن میں کیا ہے جو 1846ء میں بمقام لیپسبرگ چھپا ہے۔ اسی مترجم نے بوستان کا بھی ترجمہ کیا ہے جس کا نام لسٹ گارٹن ہے اور جو 1850ء میں دو جلدوں میں چھپا

ہے انگریزی میں گلستان کا ترجمہ ایک تو گلیڈون نے کیا ہے جو بمقام لندن 1808ء میں چھپا اور ترجمہ راس صاحب کا ہے جو ایشیا ٹک سوسائٹی کے لیے کیا گیا تھا۔ ایک اور ترجمہ ایسٹوک نے انگریزی میں کیا ہے نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں جو 1852ء میں بمقام ہرٹ فورڈ چھپا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ سعدی کی کلیات فارسی و عربی چھوٹی تقطیع کے کاغذ پر ہیرنگٹن نے 1791ء میں چھپوائی تھی۔ اور گلیڈون نے صرف گلستان 1806ء میں چھپوائی جو دوبارہ 1809ء میں بمقام لندن مطبوع ہوئی۔ پھر 1807ء میں ڈیولن نے گلستان معہ اپنے ترجمہ کے کلکتہ میں چھپوائی جو کہ اُس وقت سے اب تک کئی بار پتھر پر چھپ چکی ہے۔ پروفیسر فاکر نے فارسی خواں طلبہ کے لیے بوستان کا نہایت عمدہ انتخاب کر کے چھپوایا ہے جس میں تقریباً تہائی کتاب داخل ہے اور بعض حکایات کے ترجمے حواشی سمیت ایشیا ٹک جرنل میں معہ متن کے چھاپے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اے اسپرنگ نے 1851ء میں بمقام کلکتہ گلستان معہ اعراب اور علامات وقف کے چھپوائی تھی اور ایسٹوک نے بمقام ہرٹ فورڈ 1850ء میں اُس کو کئی قلمی نسخوں سے صحیح کر کے معہ فرہنگ کے شائع کیا۔

مذکورہ بالا ترجموں اور ایڈیشنوں کے سوا جن کا ذکر انگلش انسائیکلو پیڈیا میں کیا گیا ہے اور بہت سے نئے ترجمے اور ایڈیشن خصوصاً 1852ء کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ از انجملہ 1871ء میں جان پیٹ انسپکٹر مدارس ممالک متوسط نے اصل گلستان معہ انگریزی فرہنگ کے حسن اہتمام اور صحت کے ساتھ لندن میں چھپوائی تھی۔ اور کپتان ولبر فورس کلاک نے بوستان کا انگریزی ترجمہ 1879ء میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ اُس نسخہ سے کیا گیا ہے جو جرمنی کی اورینٹل سوسائٹی میں 1851ء میں چھپا تھا۔ پھر حال ہی میں بوستان کی چیدہ حکایتوں کا ترجمہ میجر میکین نے نظم میں کیا ہے جس کا نام فلورڈ فرمودی بوستان رکھا ہے۔

ہندستان میں بھی متعدد زبانوں میں گلستان کا ترجمہ ہوا ہے۔ از انجملہ میر شیر علی افسوس تخلص نے مارکوئس ولزلی گورنر جنرل کے عہد میں اُس کا اردو ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں لکھا ہے مگر چونکہ اُس وقت تک اردو زبان خوب منجھ کر صاف نہ ہوئی تھی اس لیے زمانہ حال کے ترجمے جو اُس کے بعد ہوئے ہیں زیادہ صاف اور با محاورہ اور فصیح ہیں۔ بنگالی اور گجراتی میں بھی گلستان کے ترجمے ہوئے ہیں مگر اُن کا مفصل حال معلوم نہیں ہے۔ بھاشا میں اول شمال

مغربی اضلاع میں گلستان کے آٹھویں باب کا ترجمہ کیا گیا تھا جس کی اشاعت کو تقریباً تیس برس گزرے ہوں گے۔ اس ترجمہ کا نام مترجم نے پشپو پانکا (یعنی باغ کی ایک کیاری) رکھا ہے۔ اس کے بعد ہمارے دوست پنڈت مہر چند اس مہاجن اُردو وال جینی مذہب متوطن قصبہ سونی پت ضلع دہلی نے حال ہی میں ساری گلستان کا ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں نہایت کوشش سے کیا ہے جو 1888ء میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔ اس ترجمہ کا نام پشپو پانکا رکھا ہے جو کہ لفظ گلستان کا مرادف ہے۔ پنڈت صاحب نے پند نامہ شیخ یعنی کریم بھی بھاشا ترجمہ چوپائی وزن کی نظم میں لکھا ہے جس کا نام شیکشا متری ہے۔

ترجمہ کے علاوہ گلستان بلکہ بوستان کی بھی بہت سی شرحیں اور فہرستیں لکھی گئی ہیں جن میں سے خان آرزو کی خیابان گلستان اور نیک چند کی بہار بوستان زیادہ مشہور ہیں۔ علی الخصوص گلستان کی قدرو منزلت ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی ہے۔ جس طرح اہل علم نے مختلف زبانوں میں اُس کے ترجمے کیے ہیں اور شرحیں وغیرہ لکھی ہیں یا اہل تعلیم نے فارسی تعلیم کی بنیاد اس پر رکھی ہے یا منشیوں نے اُس کے فقرات و ابیات سے اپنے منشآت کو زینت دی ہے اسی طرح امرانے اُس کے نسخے نہایت خوش خط لکھوا کر اُن کو مطلق اور مذہب کرایا ہے یہاں تک کہ ہمارے ملک کے رئیسوں نے بھی جو درس و کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اس کی حد سے زیادہ قدر کی ہے۔ بعضوں نے ایک ایک نسخہ کی تیاری اور تزئین میں لاکھ لاکھ روپیہ کے قریب صرف کیا ہے۔ اگرچہ ان باتوں کو کتاب کی اصلی عظمت اور خوبی سے کچھ تعلق نہیں ہے لیکن گلستان کی عام قبولیت پر اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کے رئیس اس کو اس قدر عزیز رکھیں۔ گویا اپنے گانے پر کبھی ایسا فخر نہیں کرتا جیسا اُس وقت کرتا ہے کہ ایک اناڑیوں کی مجلس میں جا چھنے اور اُن کو محظوظ کر کے اُٹھے۔

گلستان کے ابواب کی عمدہ ترتیب، اُس کے فقرہوں کی برجستگی، اُس کے الفاظ کی مناسبت، اُس کے استعارات کی جزالت، اُس کی تمثیلات و تشبیہات کی طرُق اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک معتد بہ حصہ اُس کی تصنیف میں صرف کیا تھا اور اُس کی تنقیح و تہذیب میں اپنے فکر

اور سلیقہ سے پورا پورا کام لیا تھا۔ چنانچہ دیباچہ گلستان کے اخیر میں اُس نے صاف کہا ہے کہ ”برنے از عمر گرانمایہ بروخرج کردیم“ مگر دیباچہ ہی کی ایک اور عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس فصل بہار کے آغاز میں اُس کا لکھنا شروع ہوا تھا وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہو گئی اور اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ شیخ نے گلستان چند مہینے سے زیادہ میں نہیں لکھی مگر یہ بالکل غلط ہے جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خونِ جگر کی چاشنی نہ ہو۔ اور جس قدر اُس میں زیادہ صفائی اور گلاؤٹ پائی جائے اُسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اُس کی درستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی۔ یورپ میں اکثر نامی مصنفوں کے مسودے ہم پہنچا کر نہایت احتیاط اور حفاظت سے رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اٹلی کے شمالی حصہ میں جو دیزا ایک بستی ہے وہاں مشہور مصنف ایریٹو کے مسودے اب تک موجود ہیں۔ اُس مصنف کا کلام سادگی اور صفائی اور بے تکلفی میں مشہور ہے مگر اُس کے مسودے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فقرے لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور حد سے زیادہ صاف ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹے گئے ہیں۔ لارڈ مکالی جو انگلستان کا نہایت مشہور اور مقبول مصنف ہے اُس کا ایک مسودہ لندن موزیم میں رکھا ہے اس میں بھی جا بجا کاٹ چھانٹ اور حلف و اصلاح پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض فقرے دس دس دفعہ کاٹے گئے ہیں۔ ظاہراً شیخ نے جو گلستان کے دیباچہ میں فصل بہار کا ذکر کیا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ گلستان کے لیے جو سرمایہ اُس نے سالہا سال میں جمع کیا تھا وہ پہلے اُس کے پاس تا مرتب موجود تھا جب وطن میں پہنچا تو دوستوں کی تحریک سے اُس کو مرتب کر دیا یہ ترتیب فصل بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اُس کے تمام ہونے سے پہلے ختم ہو گئی گلستان اور نیز بوستان کی ترتیب جس سلیقہ سے شیخ نے کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کو اس کام میں بہت وقت اٹھانی پڑی ہوگی۔ اُس نے ان کتابوں میں زیادہ تر وہ واقعات لکھے ہیں جو خود اُس پر گزرے ہیں یا اُس کے سامنے پیش آئے۔ اور ہر ایک باب کی تکمیل کے لیے کسی قدر حکایتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو کسی سے سنیں یا کتابوں میں پڑھیں۔ اس تمام مجموعے کو گلستان میں آٹھ باب پر اور بوستان میں دس باب پر تقسیم کیا ہے اور ہر ایک باب میں اُس کے مناسب حکایتیں درج کی ہیں اور ظاہراً علمِ اخلاق کی کوئی فرع ایسی نہیں ہے جو

بقدر ضرورت ان میں سے ہر ایک کتاب میں بیان نہ کی گئی ہو۔ یہ بات تقریباً ایسی ہی مشکل تھی جیسے کوئی شخص سیر و سیاحت کے واقعات ایسی ترتیب سے لکھے کہ اُس میں علم اخلاق کے ہر ایک باب کا مطلب اجمالاً یا تفصیلاً بقدر ضرورت آجائے اس ترتیب کی قدر اُس وقت معلوم ہو سکتی ہے کہ دونوں کتابوں کی اصل حکایتوں کو نامرتب کر کے گڈمڈ کر دیا جائے اور ہر ایک حکایت سے جو نتیجہ شیخ نے استخراج کیے ہیں وہ اُن میں درج نہ کیے جائیں اور پھر تمام مجموعہ حکایت کو جدا جدا بابوں پر تقسیم کر لیا جائے اور پوچھا جائے کہ وہ حکایت کون سے باب سے علاقہ رکھتی ہے اور یہ کون سے باب سے۔

جس طرح ہر ایک ملک میں لٹریچر کی ابتدا نظم سے ہوتی رہی ہے اسی طرح ایران میں بھی اول شاعری کا ظہور ہوا تھا۔ اور دوسری صدی کے اخیر سے جب کہ اول ہی اول خواجہ عباس مروزی نے مامون کی مدح میں فارسی قصیدہ لکھا۔ کئی صدیوں تک مقتضائے وقت کے موافق صرف شاعری کو ترقی ہوتی رہی۔ فارسی نثر لکھنا اگرچہ ایک مدت کے بعد شروع ہو گیا لیکن شیخ کے زمانہ تک اُس کی کوئی عام شاہراہ مقرر نہیں ہوئی اکثر سیدھی سادی عبارت عام روزمرہ اور بول چال کے موافق لکھی جاتی تھی یا اہل علم کسی قدر خواص کے روزمرہ میں تحریر کرتے تھے چنانچہ حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ جو کہ پانچویں صدی میں لکھا گیا اس میں نہایت بے تکلفی سے خواص کی معمولی بول چال میں حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ اور بعض ادیب و فاضل جن پر عربیت غالب تھی اُن کے قلم سے بغیر فکر اور غور کے اکثر عربی لغات اور اشعار وغیرہ فارسی تحریروں میں تراش کر تے تھے۔ مگر نثر میں شاعرانہ شوخی اور جادو پیدا کرنا اور اُس کے فقروں میں ایک خاص قسم کے وزن اور قول کا لحاظ رکھنا جاری نہ ہوا تھا۔ خصوصاً کوئی اخلاقی کتاب عمدہ نثر میں شیخ کے زمانہ تک ایسی نہیں لکھی گئی تھی جس میں اخلاق کا بیان واقعات نفس الامری کے ضمن میں کیا گیا ہو۔ 551ھ میں قاضی حمید الدین ابو بکر نے مقامات بدیعی اور مقامات حریری کی طرز پر فارسی میں مقامات حمیدی لکھی ہے اُس میں نہایت تکلف اور تصنع پایا جاتا ہے اُس کی بنیاد زیادہ تر صنائع لفظی پر رکھی ہے اور تمام کتاب بدیعی اور حریری کی طرح معنی اور مسجع لکھی ہے اور جس طرح ان دونوں کتابوں میں فرضی قصے وضع کیے گئے ہیں اُسی طرح اُس میں بھی محض خیالی افسانے لکھے ہیں جن میں گھٹانے بڑھانے اور ہر

قسم کے تصرف کرنے کا اختیار مصنف کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس کتاب کے پڑھنے سے کوئی خیال اس کے سوادِ دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف کو عربی لغات پر بہت عبور تھا اور تجنیس و ترمیم اور دیگر صنائعِ لفظی کے برتن پر کافی قدرت رکھتا تھا۔

ایک اور کتاب موسوم بہ قابوس نامہ پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہماری نظر سے گزری ہے جس کا مصنف قابوس¹ بن سکندر ملقب بہ عنصر المعانی ہے یہ تمام کتاب اخلاق اور آداب معاشرت میں لکھی گئی ہے اس کا بیان بہت صاف اور سادہ ہے اور مضامین عمدہ ہیں لیکن اس کے سوا کوئی ندرت یا دلچسپی اُس کی عبارت میں نہیں پائی جاتی۔

غرض کہ شیخ نے آنکھ کھول کر نثر کا کوئی ایسا عمدہ نمونہ نہیں دیکھا تھا جس کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ گلستان کی بنیاد اُس پر رکھی گئی ہوگی۔ حق یہ ہے کہ وہ خود ہی اس روش کا موجد تھا اور اُسی پر اُس کا خاتمہ ہو گیا۔

اُس نے اپنی دونوں بے نظیر کتابوں میں برخلاف ایرانی نثریوں کے اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی ظاہر کرنی یا اپنا تقلید اور تبحر علمی جتانایا عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھ کر لوگوں کا دل لہانا اور عجائبات کا طلسم باندھ کر خلقت کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہا۔ اُس نے دونوں کتابوں میں باشتنا چند حکایتوں کے کوئی واقعہ ایسا نہیں لکھا جو عقل یا عادت کے خلاف ہو یا جس کو سن کر کچھ زیادہ تعجب ہو۔ وہ اکثر اپنی آنکھ کی دیکھی یا کان سے سنی یا کسی کتاب سے انتخاب کی ہوئی ایسی سیدھی سادی معمولی باتیں لکھتا ہے جو صبح سے شام تک ہر انسان پر گزرتی ہیں۔ عام حکایتیں جو ان دونوں کتابوں میں درج ہیں وہ اس قبیل کی ہیں کہ مثلاً ایک بد معاش سائل نے اپنے کو قرضدار ظاہر کر کے ایک بزرگ سے دودینار حاصل کیے۔ لوگوں نے کہا یہ تو مکار تھا۔ اس کو کچھ دینا نہ چاہیے تھا۔ فرمایا اگر مکار تھا تو میں اُس کے شر سے بچا ورنہ وہ ادوروں کے شر سے بچا۔

یہ کہ ایک بادشاہ نرہ کے تاج کا لعل اندھیری رات میں ایک پتھریلی جگہ گر پڑا بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ پتھریوں میں سے لعل پانا چاہتا ہے تو ہر پتھری کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ۔

1۔ یہ شخص دیارِ آل زیار میں سے ایک بادشاہ ہے جس نے بڑ جان اور گیلان وغیرہ میں اکیس برس حکمرانی کی ہے اور 462ھ میں وفات پائی۔

یابہ کہ میں چند رویشوں کے ساتھ روم میں پہونچا اور ہم سب ایک ذی مقدور شیخ کے ہاں اُترے اُس نے ہماری ہر طرح سے خاطر کی مگر کھانے کو کچھ نہ دیا۔

ان سیدھی سادی حکایتوں کو وہ ایسے لطیف اسلوب سے بیان کرتا ہے اور اُن سے ایسے پاکیزہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ ایک نہایت بے حقیقت بات حقیقت میں ایک نکتہ یا ایک دلچسپ قصہ معلوم ہوتا ہے۔

گلستان اور بوستان کو پڑھ کر دو باتوں میں سے ایک بات کا ضرور اقرار کرنا پڑتا ہے۔ یا تو یہ کہ انتخاب کرنے میں شیخ کا مذاق ایسا صحیح تھا کہ جو حکایت وہ ان کتابوں میں درج کرنی چاہتا تھا اُس میں کوئی نہ کوئی لطیف اور چمکتی ہوئی بات ضرور ہوتی تھی اور یابہ کہ وہ اپنی خوش سلیقگی اور حسن بیان سے ایک مبتذل اور پیش پا افتادہ مضمون کو بھی اُسی قدر دلآویز طور پر بیان کر سکتا تھا جیسے ایک نرالے اور اچھوتے خیال کو۔

تعجب ہے کہ شیخ کی گلستان آئندہ نسلوں کے لیے نثر فارسی کا ایک لا جواب نمونہ تھی۔ ایران میں اُس کے تتبع کا کسی نے خیال نہیں کیا یا یوں کہیے کہ کسی سے اُس کا تتبع نہیں ہو سکا۔ اگرچہ شیخ کے بعد نثر فارسی کی ترقی یا وسعت انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور نثر لکھنے پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کمر باندھی جن کا علم و فضل شیخ سے ہر اتب فائق تر تھا مگر سب کی ہمت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصور رہی۔

ایران میں سب سے بڑا ثناء فضل اللہ بن عبد اللہ شیرازی سمجھا جاتا ہے جو شیخ کے اخیر زمانہ میں ہوا ہے اُس کی مشہور کتاب تاریخ و صاف سے بیشک اُس کا کمال علمی اور عربی و فارسی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے لیکن ساری کتاب میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا نکلے جو متوسط درجہ کی استعداد کا آدمی ڈکشنری کھولے بغیر سمجھ سکے یا جس کا انداز بیان دل میں جا کر چمکے 712ھ میں جب کہ سلطان محمد اولجا تو خان خدا بندہ کے حکم سے آذربایجان میں شہر سلطانہ بن کر تیار ہو چکا اور اس خوشی میں سلطان کی طرف سے تمام شہر کی دعوت کی گئی۔ اس کتاب کی تقریب اور تعریف سلطان کے حضور میں کی گئی۔ سلطان نے اُس میں سے کچھ متفرق فقرے پڑھنے کا حکم دیا۔ اس وقت دربار میں وزیر رشید الدین اور قاضی القضاۃ نظام الدین عبد الملک اور خواجہ اصفیل الدین طوسی اور بڑے بڑے عالم اور

فاضل موجود تھے فضل اللہ نے چند دعائیہ فقرے کہ اُن سے زیادہ سلیس اور آسان عبارت شاید تمام کتاب میں نہ ہوگی خاص سلطان کے سنانے کو لکھے تھے وہ پڑھنے شروع کیے سلطان ہر فقرہ کے معنی رشید الدین وغیرہم سے پوچھتا تھا یہ لوگ اُس کی شرح بہت بسط کے ساتھ کرتے تھے تب سلطان کی سمجھ میں کچھ آتا تھا یا شرے شرمائے کچھ ہاں ہوں کر دیتا تھا۔ یہ حال تاریخ و صاف کی عبارت کا ہے اُس کے بعد بھی زیادہ تر نثر لکھنے والوں نے اسی بات میں کوشش کی ہے کہ اُن کی نثر کے سمجھنے میں ناظرین کو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں اور اُن کے علم و فضل اور ہمہ دانی کا اعتقاد دلوں میں پیدا ہو مگر یہ ارادہ بہت کم کیا گیا ہے کہ مفید خیالات و ذوق فہم الفاظ اور دلاویز عبارت میں ادا کیے جائیں۔

تین کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جو شیخ کے بعد گلستان کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ایک مولانا عبدالرحمن جامی کی بہارستان، دوسری مجد الدین خوانی¹ کی خارستان، تیسری حبیب قاضی² شیرازی کی پریشان سواول ہم بہارستان کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ خارستان کو عبارت کی خوبی اور جزالت کے لحاظ سے بہارستان کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو خارستان کا طریقہ تحریر اکثر جگہ اہل زبان کی روش سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب دونوں کو گلستان کے مقابلہ میں لایا جاتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور شمع دونوں کی روشنی کا نور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بہارستان اور خارستان دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور ایک کو دوسرے سے بہتر کہنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ حکایتیں اور روایتیں جو ان دونوں کتابوں میں درج کی گئی ہیں وہ فی الحقیقت گلستان کی حکایتوں سے بہت ملتی جلتی ہیں اور زیادہ تر مجد الدین خوانی نے اپنی کتاب کے ابواب بھی اُسی طریقہ پر مرتب کیے ہیں مگر شیخ کے حسن بیان اور لطف ادا سے گلستان نے ایک خاص صورت پیدا کی ہے جس کے سبب سے وہ بالکل انوکھی اور نرالی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند اس قسم کی ہم شکل

1۔ یہ شخص اکبر کے عہد میں خراسان سے آیا تھا۔ خوف خراسان میں ایک مشہور ہستی ہے۔ کہتے ہیں کہ خراسان اس نے اکبر کے حکم سے لکھی تھی۔

2۔ یہ شخص زمانہ حال کا ایک نہایت مسلم اور مقبول شاعر ہے جس کو اہل ایران خاتم اشعرا سمجھتے ہیں۔ اُس کی وفات کو چالیس برس سے زیادہ نہیں گزرے۔

اور ہم جنس کتابوں میں پورا پورا فرق اور امتیاز کرنا بغیر وجدان صحیح اور ذوق سلیم کے ممکن نہیں ہے۔ لیکن چند متحد المضمون فقروں کے مقابلہ کرنے سے کسی نہ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سا اسلوب بیان زیادہ صاف اور پاکیزہ و دلآویز ہے اور کون سا کم اس لیے چند ایسی مثالیں جو نہایت دقت اور جستجو سے بہم پہنچی ہیں۔ اس مقام پر نقل کی جاتی ہیں۔

گلستان اور بہارستان کا مقابلہ

بہارستان: اسکندر را گفتند بچہ سبب یافتی
آنچه یافتی از دولت سلطنت و مملکت با صغرن و
حداثت عہد۔ گفت با ستمالت دشمنان تا از
غائلہ دشمنی زمام تاختند و از تعاہد دوستان تا در
قاعدہ دوستی استحکام یافتند۔

بیت

با بدت ملک سکندر چون وے از حسن سیر
دشمنان را دوست گردان دوستان را دوست تر

گلستان: اسکندر را پرسیدند کہ دیار مغرب
مشرق را بچہ گرفتگی کہ ملوک پیشین را خزائن و عمرو
ملک و لشکر بیش از تو بود و چنین فتح میسر نشد۔
گفت بچوں خداے عزوجل ہر مملکتے را کہ
گرفتہم رعیتش را نیاز مردم و رسوم خیرات
گذشتگان باطل نہ کردہ و نام بادشاہان جز بہ
کوکئی نہ بردہ۔

بیت

بزرگش خوانند اہل خود کہ نام بزرگان بڑھتی برد

قطعہ

این ہمہ پنج است چون می بگذرد
بخت و تخت و امر و نہی کیرو دار
نام نیک رفتگان ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

ان دونوں عبارتوں میں باعتبار فصاحت و بلاغت کے جو فرق ہے اُس کا فیصلہ زیادہ تر ذوق صحیح پر منحصر ہے مگر جس قدر قید بیان میں آ سکتا ہے وہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اس سے محض گلستان کی فوقیت جتنی مقصود ہے نہ کہ بہارستان کی تنقیص کرنی۔ اول ”اسکندر را پرسیدند“ اور ”اسکندر را گفتند“ میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ سوال کے موقع پر پرسیدن بہ نسبت گفتن

کے زیادہ مناسب ہے۔ دوسرے شیخ کے ہاں خزانہ و عمر و ملک و لشکر چار لفظ ایک دوسرے پر معطوف ہیں اور کوئی لفظ حشو و بیکار نہیں ہے۔ اور مولانا کے ہاں دولت سے اگر سلطنت مراد ہے تو سلطنت و مملکت دونوں ورنہ صرف لفظ مملکت حشو ہے اور صغرن کے بعد حداثت عہد بھی حشو ہے۔ تیسرے شیخ کے ہاں بیان میں سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ باوجود کی لشکر و ملک و عمر و مال کے مشرق و مغرب کو فتح کرنا تعجب سے خالی نہ تھا۔ اور مولانا کے ہاں سوال کی وجہ ایسی ظاہر نہیں ہے کیونکہ تھوڑی عمر میں بہتیرے لوگوں نے دولت اور سلطنت حاصل کی ہے۔ چوتھے سکندر کا جواب جو شیخ نے نقل کیا ہے اُس میں ہرگز اس سے زیادہ اختصار کی گنجائش نہ تھی ورنہ سکندر کا جواب ناقص رہتا۔ اور جو جواب مولانا نے نقل کیا ہے وہ ان لفظوں میں ادا ہو سکتا تھا۔ ”یہ استمالت دشمنان و تعاہد دوستان“ اس سے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ پانچویں شیخ نے جو نتیجہ حکایت کے مضمون سے نکال کر اشعار میں بیان کیا ہے وہ کئی وجہ سے مولانا کے نتیجہ کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ شیخ کا نتیجہ لازمی ہے۔ اور مولانا کا نتیجہ غیر لازمی۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو زیادہ دوست بنائے گا اُس کو ضرور سکندر کی سی سلطنت حاصل ہو جائے گی۔ اس کے سوا مولانا نے حقیقت میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا بلکہ حکایت کا خلاصہ ایک بیت میں دوبارہ بیان کر دیا ہے۔ اور شیخ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک اچھوتا مضمون ہے کہ جب تک بیان نہ کیا جاوے ہر شخص کا ذہن وہاں تک انتقال نہیں کر سکتا۔ نیز شیخ نے ایسا حاوی نتیجہ نکالا ہے جو تمام مخلوق کو شامل ہے۔ کیونکہ سلف کی تعظیم اور ادب اور اُن کے محاسن و کمالات کی قدر کرنی ہر شخص کے حق میں شمر برکات ہے اور مولانا کا نتیجہ صرف سلاطین و الٰہ العزم کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ ملک سکندر کی خواہش اُن کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی۔

گلستان:

راز یکہ نہاں خواہی با کسے در میان منہ اگر چہ
دوست باشد کہ مرا آن دوست را نیز دوستان
باشند و بچکنیں۔

بہارستان:

اسرار نہاں خود را با بیچ دوستی در میان منہ زیرا
کہ بسیار بود کہ در دوستی غفل افتد و بد شمنی بدل
گردد۔

مسل قطعه

خامشی بہ کہ ضمیر دل خویش
با کے گفتن و گفتن کہ گوئے
اے سلیم آب ز سر چشمہ بہ بند
کہ چوں پُرسد نتوان بستن جوئے

بیت

سخنے در خلا نباید گفت
کان خن بر ملا نشاید گفت

قطعه

اے پسر سرے کش از دشمن نہفتن لازمست
بہ کہ از افشائے آن بادوستی کم دم زنی
دیدہ ام بسیار کز سیر سپہر کج نہاد
دوستاں دشمن شوند و دوستیہا دشمنی

قطعه

بر سر سر بمہر کہ افتد بخاطرت
سرعت مکن بہ موج بیانش نگاشتن
ترسم شود غرامتِ اظہارِ آن ترا
مشکل تر از ندامتِ پوشیدہ داشتن

اس مثال میں بھی گلستان کا بیان بہارستان کی نسبت چند وجوہ سے زیادہ یلغ ہے۔
(1) شیخ کہتا ہے ”راز یکہ نہان خواہی“ یعنی جس بھید کو چھپانا منظور ہو اُسے کسی سے نہ کہو۔ اور مولانا کہتے ہیں ”اسرار نہان خود را“۔ یعنی اپنے پوشیدہ بھیدوں کو ظاہر نہ کرو۔ حالانکہ بعضے بھید کیسے ہی پوشیدہ ہوں ایک مدت کے بعد کہنے کے لائق ہو جاتے ہیں مگر جن کا چھپانا منظور ہوتا ہے وہ کبھی کہنے کے لائق نہیں ہوتے۔ (2) شیخ کہتا ہے ”با کس در میان منہ اگر چہ دوست باشد“ اور مولانا کہتے ہیں ”بہ ہیچ دوستی در میان منہ“ پہلے بیان میں دوست اور غیر دوست سب سے راز کہنے کی ممانعت ہے مگر دوسرا بیان جب تک اس طرح نہ ہو ”با دوست ہم در میان منہ“ تب تک اُس میں تعیم پیدا نہیں ہوتی۔ (3) شیخ نے راز نہ کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اُس کے بھی دوست ہوں گے اور اُن دوستوں کے بھی دوست ہوں گے اور یہ سلسلہ اس طرح چلا جائے گا۔ پس چپکے ہی چپکے راز جمہور میں پھیل جائے گا۔ مولانا نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ شاید دوستی میں خلل آجائے اور دوست دشمن ہو جائے اگر چہ مطلب دونوں صحیح ہیں لیکن پہلی وجہ زیادہ موجب ہے کیونکہ یقیناً کوئی شخص دوستوں سے خالی نہیں ہوتا اور دوستی میں فرق آجانا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ (4) شیخ کا قطعہ بلاغت میں مولانا کے قطعہ سے براتب افضل اور فائق تر ہے۔ پہلی بیت میں اُس نے انسان کی ایک ایسی غامض اور دقیق

خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام نظروں سے مخفی ہے وہ کہتا ہے:

خامشی بہ کہ ضمیر دل خویش با کے گفتن و گفتن کہ ملوے

یعنی کسی سے اپنا بھید کہہ کر اُس کو افشاے راز سے منع کرنا کچھ مفید نہیں ہے کیونکہ انسان ممنوعات پر زیادہ حریص ہوتا ہے اس لیے اب اُس کو ضبط راز کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔ پس اس سے خامشی ہی بہتر ہے۔ دوسری بیت میں ایک نہایت لطیف اور واضح مثال سے مطلب کو خاطر خواہ دلنشین کیا ہے۔ مولانا کے قطعہ میں کوئی خوبی اس مضمون کے سوا نہیں ہے کہ جو راز دشمن سے چھپانا چاہیے اُسے دوست سے بھی چھپانا چاہیے۔ مگر آن کے ساتھ لفظ افشا زائد معلوم ہوتا ہے کیونکہ ”از ان دم نرنی“ کہ جگہ ”از افشاے آن دم نرنی“ کہا گیا ہے اور قطعہ کا اخیر مصرعہ بھی حشویا تکرار سے خالی نہیں ہے۔ دوستوں کا دشمن ہو جانا اور دوستی کا دشمنی ہو جانانی الحقیقت ایک ہی بات ہے۔ (5) قطعہ کے بعد شیخ نے ایک فرد لکھی ہے جو فی الواقعہ سہل و متمنع ہے۔ یعنی۔

سخنے در خلا نباید گفت کان سخن بر ملا نشاید گفت

یہ دھوکا اکثر اشخاص کو ہو جاتا ہے کہ جب صحبت میں کوئی غیر جنس نہیں ہوتا تو ناگفتنی باتیں کہنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تخیلے میں گفتگو کر رہے ہیں اس سے اغیار مطلع نہیں ہو سکتے حالانکہ وہ باتیں ضرور رفتہ رفتہ منتشر ہو جاتی ہیں۔ اس مجرب اور سچے مضمون کو جو کسی قدر دقیق بھی تھا ایسے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ اُس سے زیادہ بیان کی صفائی ممکن نہیں۔ پھر خلا اور ملا اور در اور بر کا مقابلہ اور صنعت ذوقا فتمین اُس کے علاوہ ہے۔ مولانا نے کوئی فرد نہیں لکھی مگر ایک دوسرا قطعہ لکھا ہے یعنی ”ہر بر سر بمہر کہ اُفتد بخاطر الخ“ اس میں پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جو راز سر بستہ تیرے خیال یا دل میں گزرے اور مطلب یہ ہے کہ جو بھید تیرے دل میں موجود یا مستور ہو پھر ”ہموج بیانش نگاشتن“ کا لفظ ”اظہار آن“ کی جگہ لایا گیا ہے جس میں نہایت تکلف ہے۔ پھر اخیر مصرعہ میں ندامت کا لفظ شاید بے محل ہے کیونکہ انخاے راز سے کبھی ندامت نہیں ہوتی۔ باوجود ان تمام باتوں کے دونوں مثالوں میں

شیخ کے ہاں کوئی لفظ غریب یا غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا اور مولانا کے ہاں اکثر الفاظ بمقابلہ گلستان کے الفاظ کے غریب معلوم ہوتے ہیں جیسے حد امیت عہد، غائلہ، تعابد، ہموں بیانش نگاشتن، غرامت۔

گلستان اور خارستان کا مقابلہ

خارستان: ہر کہ در گرسنگی طاقت نیار د باید کہ
سہ یک شکم را از طعام پُر کند و سہ یک دیگر از
آب و سہ یک دیگر از برائے نفس زدن رہا
کند۔ لہذا صوفیان وقت مامیگویند کہ تو ہمہ شکم
را از طعام پُر کن آب خود چیز لطیف ست
خود را جائے میکند کہ لطیفان را جائے کم نباشد
و نفس را جائے گومباش۔

بیت

بشنو کہ چہ گفت صوفی پرواری
چون سیر شدی چراغِ جان داری

خارستان: علم با عمل پہچو طعام بانمک ست
ہر کرا ہر دو ہست حکمتے تمام دارد و طعام بے
نمک را چہ توان کرد۔

بیت

عمل بے علم نامضبوط باشد
ہمیشہ شرط با مشروط باشد

گلستان: حکیمان دیر دیر خورد و عابدان نیم
سیر۔ و زاهدان تاسد رنق۔ و جوانان تا طبق
بر گیرند۔ و پیران تا عرق کنند۔ لہذا قلندر ان
چندان خورد کہ در معدہ جائے نفس نماند و بر
سفرہ روزی کس۔

بیت

اسیر بند شکم را دوشب نگیرد خواب
شے ز معدہ سگی شے ز دل تنگی

مثال دوم

گلستان: عالم تا پرہیزگار کور مشعلہ دار ست
یہدی بہ و ہولا یہندی۔

بیت

بیفائدہ ہر کہ عمر در باخت
چیزے نخرید و زر بینداخت

مذکورہ بالا مثالوں کو دیکھ کر غالباً ہر شخص جو فارسی زبان سے فی الجملہ آشنا ہے بخوبی اندازہ

کر سکتا ہے کہ خاورستان کی عبارت گلستان کے مقابلے میں کس قدر کم وزن اور بے وقعت ہے اسی لیے ہم اس مقام کو ناظرین کے مذاق اور تمیز پر چھوڑ دیتے ہیں اور زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے۔

پریشان کا مصنف مرزا حبیب قاسمی کتاب مذکور کے خاتمہ کے اشعار میں تصریح کرتا ہے کہ اُس کی عمر تیس برس سے بھی دو تین برس کم تھی جب یہ کتاب اُس نے لکھی ہے۔ اور شیخ نے گلستان کو سن کہولت اور اوائل سن شیخوخت میں مرتب کیا ہے۔ پس اگر قاسمی سے گلستان کا پورا پورا تتبع نہ ہو سکا تو کچھ تعجب نہیں کیونکہ ایک ایسی کتاب کا سرانجام کرنا جس کی بنا محض حکمت اور تجربت پر ہونی چاہیے شیخ کے مقابلے میں ایک نوجوان نا تجربہ کار کی طاقت سے باہر تھا۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو بڑی عمر میں قاسمی سے گلستان کا جواب اتنا بھی لکھا جانا مشکل تھا کیونکہ اُس کی تمام عمر قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی ہے جس میں محض خیالی ڈھکوسلے باندھنے اور الفاظ تراشی کے سوا حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں ہوتی پس جس قدر قصیدہ گوئی میں اُس کو مشق و مہارت زیادہ بڑھتی تھی اُسی قدر بیان حقائق اور واقعہ نگاری کا ملکہ اُس سے سلب ہوتا جاتا تھا۔ قاسمی نے بھی گلستان کی طرح پریشان کی عبارت دلچسپ اور دلآویز کرنے میں بہت کوشش کی ہے مگر سوا اُس کے کہ تمام کتاب کو ہزل اور فحش سے بھر دیا اور چند آزاد اور بیباک نوجوانوں کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کر دیا اور کچھ اُس سے نہیں ہو سکا۔ خاتمہ کتاب کے سوا جس میں اُس نے اپنا سہ ملوک کے لیے چند ہند کر کے کچھ نصیحتیں لکھی ہیں تمام کتاب میں وہ حکایتوں کی بنیاد اکثر نہایت غلیظ فحش یا نحیف ہزل پر رکھتا ہے جس کے پڑھنے سے شرم آتی ہے اور طرہ یہ کہ پھر اُس سے نتائج عارفانہ اور متصوفانہ استخراج کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پریشان کا خاتمہ جس میں شوخی و طرافت کا کچھ سامان نہیں ہے باب ہشتم گلستان کے مقابلے میں نہایت پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام خاتمے میں شاذ و نادر ہی کوئی مضمون ایسا ہو گا جس میں کوئی ندرت پائی جائے۔ عبارت پشک عمدہ ہے مگر شیخ کی جادو بیانی کا کہیں نشان نہیں پایا جاتا۔ عام نصائح جو خاتمے میں درج ہیں وہ اس قبیل کے ہیں: چمد بادشاہ باید بہن خن چینان اعتماد کند۔ چمد بادشاہ باید دین را تو قیر کند و دشمنان دین را تحقیر فرماید۔ چمد بادشاہ باید از خدا غافل نہ ماند تا خداے از و غافل نہ باشد۔ چمد بادشاہان را در نظام ممالک دست دُر افشان بکارست و تیغ سر افشان۔

بیت

”تا کہ بدان دوستان شوند فراموش تا کہ بدین دشمنان شوند پریشان“

اور اگر کہیں عبارت میں اس سے زیادہ حسن پیدا کرنا چاہتا ہے وہاں حقیقت سے دور جا پڑتا ہے۔ مثلاً چند بادشاہ باید تو اضع کند و تکبر نفرماید کہ تو اضع صفتِ اتقیاست و تکبر صفتِ اشقیا۔ ومن گفتہ ام اہل تکبر را در نطفہ غشست چو سرکش صفتِ آتشست و شیطان از آتشست و اہل تو اضع را نطفہ پاکست چہ افتادگی صفتِ خاکست و آدم از خاک بود۔ اس بند کے پہلے حصے میں ظاہر ہے کہ کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے اور دوسرے حصے میں جو اُس نے کچھ ندرت پیدا کر نی چاہی ہے وہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے اور وہ بھی اچھی طرح بیان نہیں ہو سکا۔ اسی مضمون کو شیخ علیہ الرحمۃ نے بوستان میں اس طرح بیان کیا ہے۔

ز خاک آفریدت خداوند پاک	پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک
حریص و جہان سوز و سرکش مباحش	ز خاک آفریدندت آتش مباحش
چو گردن کشید آتش ہولناک	بہ بیچارگی تن بینداخت خاک
چو آن سرفرازی نمود این کمی	ازان دیو کردند ازین آدمی

البتہ جو عذر کہ قاضی نے پریشان کے دیا ہے میں کیا ہے اور گلستان کے مقابلے میں کتاب لکھنے سے اپنا عذر ظاہر کیا ہے اُس سے اُس کا نہایت انصاف اور گلستان کی قدر شناسی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے احباب کے نہایت سخت جبر سے پریشان کے لکھنے پر قلم اٹھایا تھا۔ وہ لکھتا ہے ”کہ ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار کیا کہ گلستان کی طرز پر نظم و نثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیے۔ میں نے کہا۔ بھائی تو بہ کر! میں! اور شیخ کی طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں؟ مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کر کے کذاب کے سوا اور کچھ خطاب نہیں پایا میں نے مانا کہ جگنورات کو چمکتا ہے لیکن کیا وہ چاندنی کی برابری کر سکتا ہے؟ شیخ کی گلستان ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں اور اہل معنی کی جان قیامت تک اس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے۔ آخر جب اس نے نہ مانا اور میرے انکار سے اُس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجبوراً کچھ نظم و نثر اور جہ و ہزل ترتیب دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پرواز میں شہباز کی برابری نہیں کر سکتی لیکن

اس کو بھی چارو ناچار اڑنا ہی پڑتا ہے۔
اب ہم چند ایسے فقرے گلستان اور پریشان سے انتخاب کر کے لکھتے ہیں جو متحد المضمون ہیں۔

گلستان اور پریشان کا مقابلہ

پریشان : دخل سرچشمہ ایست و
خارج جوے چند کہ آب سرچشمہ در
آنها جاری است و لاشک چون
سرچشمہ مسدود شود جوہا خشک شود
پس ہر کس آب در جو جاری خواہد
سرچشمہ را رعایت کند۔

ایضا۔ خرج باندازہ دخل باید کرد نہ
آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم
چہ این معنی نامعقول است کہ بار
در پیش قدم باشد و بار گیر در چیز عدم
باشد

قطعہ

الاے آنکہ حاجت ست موجود
بکارت می نیاید دخل معدوم
شنیدستی کسے از بہر جولان
نشیند بر فراز اسپ موہوم

گلستان : اے فرزند دخل آب
روانست و خرج آسیاے گردان۔
یعنی خرج فراوان کردن مسلم کے
راست کہ دخل معتین دارد

قطعہ

چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن
کہ میگویند ملاحان سرودے
اگر باران بکوہستان نبارد
بسالے دجلہ گردد خشک رودے

اس مثال میں گلستان سے صرف ایک عبارت اور پریشان کے دو مختلف مقامات سے
دو عبارتیں ایک ہی مضمون کی نقل کی گئی ہیں مگر شیخ کا بیان قافی کی دونوں عبارتوں سے زیادہ
بلغ ہے لیکن جو فرق بہت باریک اور نازک ہیں اُن کا بیان کرنا اول تو مشکل ہے۔ دوسرے

یہ امید نہیں کہ ناظرین اُس کو غور سے دیکھیں گے۔ اسی لیے صرف ایسے فرق بتائے جاتے ہیں جو زیادہ روشن اور صاف ہیں۔ شیخ کے بیان میں مخاطب کو فرزند کے ساتھ تعبیر کرنا عین بمقصد ہے۔ ایک تو اظہار شفقت جو تاصح کے لیے ضرور ہے۔ دوسرے یہ جتنا کہ نوجوان بھی اکثر اس نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر دخل و خرج کی تشبیہ آپ روان اور پن چلی کے ساتھ کیسی عمدہ تشبیہ ہے کہ جس قدر زالی ہے اُسی قدر چچی ٹٹی بھی ہے۔ پن چلی بھی بدون آپ روان کے نہیں چلتی اور خرج بھی بغیر آمدنی کے نہیں چلتا۔ پن چلی بھی پانی کے بند ہو جانے پر کسی عارضی قوت سے نہیں چلائی جاتی ہے تو اُس کی گردش عارضی اور بے ثبات ہوتی ہے۔ خرج بھی جو بدون آمدنی کے اندوختہ وغیرہ سے چلتا ہے بے بنیاد اور ناپائیدار ہوتا ہے پھر اس تمام مطلب کو جو کہ ہم نے تشبیہ کے معنی سمجھانے کے لیے لکھا ہے۔ شیخ نے ان مختصر اور جامع لفظوں میں ادا کیا ہے ”یعنی خرج فراوان کردن مسلم کے راست کہ دخل معین دارد“ اس کے بعد قطعہ میں ایک نہایت بدیہی مثال دے کر بے بنیاد خرج کا مال ہر شخص کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا ہے اور اُس مقولے کو ملاحوں کی طرف منسوب کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ ایسی بدیہی بات ہے کہ درجلے کے کنارے پر ہمیشہ ملاچی گیتوں میں گائی جاتی ہے۔ قآآنی نے آمدنی کو منبع سے اور اخراجات کو نندیوں سے تشبیہ دی ہے تشبیہ یہ بھی عمدہ ہے مگر یہ شیخ کی اُس تمثیل سے ماخوذ ہے جو اُس نے قطعے میں بیان کی ہے لیکن چونکہ یہ تمثیل نہایت موٹی اور معمولی تھی اس لیے شیخ نے اُس کو ملاحوں کی طرف منسوب کیا ہے اور قآآنی کو یہ بات نہیں سوجھی۔ پھر قآآنی کے بیان سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سرچشمے کے بند ہوتے ہی ندیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ اور شیخ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مدت کے بعد خشک ہوتی ہیں اور فی الواقع ایسا ہی ہوتا ہے جیسا شیخ نے لکھا ہے پھر شیخ نے منبع کے بند ہو جانے کو قدرتی اسباب یعنی امساک باران کی طرف مستند کیا ہے اور یہ کہا ہے ”واگر باران کو ہستان نبارد“ اور قآآنی کہتا ہے کہ جو شخص ندی جاری رکھنی چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے یعنی اُس کو بند نہ ہونے دے حالانکہ یہ امر انسان کی طاقت سے باہر ہے پھر قآآنی نے تمثیل سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جو شخص ندی کا جاری رکھنا چاہے وہ سرچشمے کی خبر رکھے۔ اگرچہ مطلب اس سے بھی مفہوم ہو جاتا ہے لیکن اس جگہ مقتضائے مقام کے موافق اُس کو یہ کہنا چاہیے تاکہ جو شخص ہمیشہ اپنا خرج جاری رکھنا چاہے

اُس کو آمدنی پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ تمثیل اسی مطلب کے سمجھانے کو دی گئی ہے نہ اس بات کے سمجھانے کو کہ اگر ندی میں پانی جاری رکھنا چاہو تو سرچشمے کی خبر رکھو۔ دوسری عبارت کو قاتل نے اس جملے سے شروع کیا ہے ”خرج باندازہ دخل باید کرد“ اس کے بعد وہ کہتا ہے ”نہ آنکہ خرج معلوم باشد و دخل موہوم“ یہ دوسرا جملہ اُس نے مقتضائے مقام کے موافق نہیں بلکہ اپنی حالت کے موافق لکھا ہے کیونکہ سنا گیا ہے کہ وہ اکثر جشن و عید وغیرہ کے موقعوں پر دخل موہوم یعنی قصائد کے صلے کی توقع پر قرض لے کر خرچ کر لیا کرتا تھا اور نہ مقتضائے مقام یہ ہونا چاہیے تھا ”نہ آنکہ دخل اندک باشد و خرج بسیار“ یا ”نہ آنکہ دخل بخی باشد و خرج دہ“ یا اور اسی مضمون کا کوئی جملہ ہوتا کیونکہ آمدنی کے موافق خرچ کرنے کا مفہوم مخالف یہی مضمون ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا وہ مضمون فی نفسہ صحیح بھی نہیں ہے کیونکہ دخل موہوم کی امید پر خرچ کرنا خاص خاص صورتوں کے سوا کسی کے نزدیک مذموم نہیں ہے۔ تمام تاجراور کاشتکار اور مدبران ملک دخل موہوم ہی کے بھروسے پر لکھو کھا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر ایسے خرچ کو جو دخل موہوم کی امید پر کیا جائے موہوم یا معدوم گھوڑے پر سوار ہونے سے کچھ مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ معدوم گھوڑے پر بے شک کوئی سوار نہیں ہو سکتا لیکن دخل موہوم کی امید پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہزاروں آدمی خرچ کر سکتے اور کرتے ہیں۔

پریشان: کسانیکہ ظرافت و شوخی

بسیار کنند یا بغایت رقیق القلب

و وسیع الخلق باشند سرداری و سالاری

لشکر را نشانید۔ چہ این صفت موجب

جسارت لشکریان شود و گاہ باشد کہ

ہر چہ گوید بہ ظرافت و شوخی حمل کنند

و نیز اندک مہربانی و وسعت خلق لازم

ست کہ لشکریان را بنیم حستن و بستن

نباشد، دور نیست کہ از نیم چشم و گوش

گلستان: خشم بیش از حد گرفتن

وحشت آرد و لطف بیوقت میت

ببرد نہ چندان درشتی کن کہ از تو سیر

گردند و نہ چندان نرمی کہ بر تو دلیر

ایہات

درشتی و نرمی بہم در بہ ست

چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہست

درشتی نکیرد خردمند پیش

نہ سستی کہ نازل کند قدر خویش

نظم

جوانے با پد رگفت اے خردمند
مرا تعلیم کن پیرانہ یک پند
بگفتا نیکمردی کن نہ چندان
کہ گردد چہرہ گرگ تیز دندان

بھوتی بادشاہ فراموش کنند و در
مخالفت ہم زبان شوند و در وقت کار
ستی کنند تا کار فاسد شود۔

مثنوی

کسے را کہ شد حکمران بر سپاہ
دو خصلت ہی داشت باید نگاہ
عتابے نہان اندر و صد خطاب
خطابے نہان اندر و صد عتاب
بہر نوش او نیش ہا جان گداز
بہر نیش او نوشہا دل نواز
بیکدست شمشیر زہراب دار
بیکدست دریای گوہر نثار

اس مثال میں گلستان اور پریشان کے مضمون میں کسی قدر فرق ہے۔ گلستان میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں ہے اور پریشان میں لشکر کے افسروں اور سپہ سالاروں کی تخصیص ہے اس لیے پورا پورا مقابلہ نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ نفس مضمون متحد ہے اس واسطے کچھ کچھ پہلو مقابلے کے نکل سکتے ہیں۔ شیخ کا بیان لفظاً و معنأً قافی کے بیان سے بمراتب فائق تر ہے۔ اول تو شیخ کے فقروں میں ایک خاص قسم کا وزن اور قول ہے۔ جو قافی کے فقروں میں نہیں ہے نثر میں ایسا تناسب بشرطیکہ معنی مقصود اور فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق نہ آئے پرلے درجے کا کمال انشا پر دازی اور اعلیٰ سے اعلیٰ کی شاعری ہے۔ شیخ کے چاروں فقروں میں الفاظ مقابلہ ایسی خوبی سے واقع ہوئے ہیں کہ معنی مقصود کو ان سے اور زیادہ روشنی ہو گئی ہے یعنی خشم اور لطف، بیش از حد اور بوقت، وحشت اور ہیبت، آرد اور ہمد، درشتی اور نرمی کو جو فساد کی حالت سے تمثیل دی ہے وہ کسی مبلغ ہے اور کس قدر مختصر لفظوں میں ادا کی گئی ہے اور دوسری ہیبت میں کتنا وسیع مضمون دو مصرعوں میں بیان کیا ہے یعنی یہ کہ درشتی کو اپنا شعار بنالینا اور کبھی نرمی نہ برتنا جیسا کہ لفظ بیش گرفتن سے مستفاد ہوتا ہے اچھا نہیں ہے کیونکہ عقلمند ایسا نہیں

کرتے اور بالکل نرمی ہی نرمی برتتا اور کبھی درشتی نہ کرنا جیسا کہ سستی کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے یہ بھی اچھا نہیں ہے کیونکہ اس سے انسان نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے پھر دوسری نظم میں صرف اتنی سی بات کہ نیکی بے عمل کرنی نہیں چاہیے کیسے عمدہ پیرایے میں بیان کیا ہے۔ خصوصاً چنداں کا قافیہ مناسب اور ہم وزن لانے کے لیے کس مطلب کو کن لفظوں میں ادا کیا ہے۔ قافیہ کی نثر میں بمقابلہ شیخ کی نثر کے کوئی بات جو قابل ذکر ہو نہیں پائی جاتی۔ اور نظم میں بھی حقیقت اور معنی کی نسبت الفاظ کی چمک دمک زیادہ ہے۔ چونکہ دونوں عبارتوں میں فرق بین معلوم ہوتا ہے اس لیے پریشان کی عبارت میں زیادہ مکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اب ہم ان اضافی خوبیوں کا بیان چھوڑ کر گلستان کے ذاتی محاسن کی طرف پھر متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی فارسی لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابل لحاظ ہے کہ فارسی اور اردو کی تحریر و تقریر میں جس قدر گلستان کے جملے اور اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں اور کسی کتاب کے نہیں دیکھے گئے۔ اُن میں سے کسی قدر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1	ہر عیب کہ سلطان بہ پسند نہ نرسد	8	پر تو نیکان نگیرد ہر کہ بنیادش بدست
2	ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت	9	افعی را کشتن و بچاش را نگاہ داشتن کار
3	حاجت مشاطہ نیست روی دلآرام را		خردمندان نیست
4	ہر چہ بقامت کہتر بقیمت بہتر	10	پسرنوح با بدان بنشست
5	ہر کہ دست از جان بشوید ہر چہ در دل		خانداں بنوش گم شد
	دارد گوید	11	دشمن نتوان حقیر و بچارہ شمرد
6	دہ درویش در گھمے بخشید و دو بادشاہ در	12	عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
	اقلیمے نہ کجید	13	در باغ لالہ رویہ و در شورہ بوم خس
7	سر چشمہ شاید گرفتن بہ میل	14	تو گمری بہ دل ست نہ بمال ویزرگی
	چوں پُر شد نہاید گذشتن بہ پیل		مقل ست نہ بمال

- 15 دشمن چہ کند چہ مہربان باشد دوست
16 حصور اچکم کوز خود برنج درست
17 قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید
18 آنا نہ غنی تر نہ محتاج تر نہ
19 چو عضوے بدر آو در روزگار
دگر عضو ہار اماند قرار
20 دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم
21 گا ہے بسلاے بر بختد وگا ہے
بد شنائے خلعت دہند
22 ہر کجا ہشمہ بود شیرین
مردم و مرغ و مور گرد آید
23 راستی موجب رضاے خداست
کس نہ دیدم کہ گم شد از رہ راست
24 آنرا کہ حساب پاکست از محاسبہ چہ پاک
25 تو پاک باش برادر مدار از کس پاک
زند جلدہ ناپاک گازران بر سنگ
26 تا تریاق از عراق آورده شود مارگزیدہ
مردہ شود
27 بہ دریا در منافع بیشمار ست
وگر خواہی سلامت بر کنار ست
- 28 دوست آن باشد کہ گیر دوست دوست
در پریشان حالی و در ماندگی
29 در میر و وزیر و سلطان را
بے وسیت مگرد پیر امن
سگ و دربان چو یافتند غریب
این گریبان بگیرد آن دامن
30 خداے راست مسلم بزرگی و الطاف
کہ جرم بیند و نان برقرار میدارد
31 بنیاد ظلم اول در جہان اندک بود ہر کہ
آمد بران مزید کرد تا بدین غایت رسید
32 ہر کہ با فولاد بازو پنچہ کرد
ساعت سیمین خود را رنجہ کرد
33 چو کردی با کلوخ انداز پیکار
سر خود را بنادانی شکستی
چو سنگ انداختی بر روے دشمن
حذر کن کاندہ آہائش نشستی
34 کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد
35 در باب کنون کہ نعت ہست بدست
کین دولت و ملک میرود دست بدست
36 گر وزیر از خدا بترسیدے
ہچنان کز ملک ملک بودے

- 37 برگردن او بماند و بر ما بگذاشت
38 اگر شہ روز را گوید شب است این
باید گفت ایک ماہ و پروین
39 جهانیدہ بسیار گوید دروغ
40 چو کارے بے فضول من بر آید
مراد روے سخن گفتن نشاید
41 اگر روزی بدانش بر فرووے
زنادان تنگ تر روزی نبودے
42 محتسب را درون خانہ چہ کار
43 ہر کہ عیب دگران پیش تو آورد و شہر د
بیگمان عیب تو پیش دگران خواہد برد
44 یار شاطر م نہ بار خاطر
45 چو از تو مے کیے بیداشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را
46 من آنم کہ من دانم
47 گے بر طارم اعلیٰ نشینم
گے بر پشت پائے خود نہ بنم
48 فہم سخن گر کند مستعقوب طبع از شکلم موی
49 خانہ دستان بروب و در دشمنان مکوب
50 درویش صفت باش و کلاہ تری دار
51 نیک باشی و بدت گوید خلق بہ کہ
بد باشی و نیکت گویند
- 52 اگر دنیا نباشد در دمنندیم
و گر باشد بمہرش پائے بندیم
53 درویش ہر کجا کہ شب آمد سراے دوست
54 پائے در زنجیر پیش دوستان بہ کہ
بایگانگان در بوستان
55 زن بد در سراے مرد نکو
ہمدین عالم است دوزخ او
56 کوفتہ رانان تہی کوفتہ است
57 ادخویشتم گم است کرار بہری کند
58 باطل است انچہ مدعی گوید
59 مرد باید کہ گیر داند رگوش
در نوشتہ ست پند برد یوار
60 خاک شو پیش از آنکہ خاک شوی
61 اگر خاکی نباشد آدمی نیست
62 ہمراہ اگر شتاب کند ہمراہ تو نیست
63 خوے بد در طہیج کہ نشست
نزد جز بوقت مرگ از دست
64 حقا کہ با عقوبت دوزخ برابرست
رفتن پائے مردی ہمایہ در بہشت
65 خوردن برائے زمین و ذکر کردن ست
تو معتقد کہ زمین از بہر خوردن ست

- 66 نہ چندان بخور کز دہانت برآید
67 عطاے او بہلقاے اذخسیدم
68 ہر کہ نان از عمل خویش خورد
69 گریہ مسکین اگر پر داشتے
70 مورہمان بہ کہ نباشد پرش
71 گفت چشم تنگ دنیا دار را
72 منعم ہوہ دشت و بیابان غریب نیست
73 شاہد آنجا کہ رود عزت و حرمت بیند
74 بہ از روے زیباست آواز خوش۔ کہ
این حظ نفس ست و آن قوت روح
75 رزق ہر چند بیگمان برسد
76 بدو طمع دیدہ ہوشمند
77 مورچگان را چو بود اتفاق
78 شیر ثیان را بدراند پوست
79 صیاد نہ ہر بار شکارے بہر
باشد کہ یکے روز پائش بدرد
80 گردن بے طمع بلند بود
81 این شکم بے ہنر پیچ پیچ
82 صبر ندارد کہ بسازد بہ پیچ
83 یکے نقصان مایہ و دوم شامت ہمایہ
84 اگر از ہردو جانب جاہلانند
85 اگر زنجیر باشد یکسلانند
86 مرا بخیر تو امید نیست بدمرسان
87 تو براوچ فلک چہ دانی چیست
88 چون ندانی کہ دسر اے تو کیست
89 گر تو قرآن بدین منط خوانی
90 بری رونق مسلمانی
91 چشم بداندیش کہ بر کندہ باد
92 عیب نماید ہنرش در نظر
93 نکوئی با بدان کردن چنانست
94 کہ بد کردن بجائے نیکمردان
95 سرمانداری سرخویش گیر
96 ناز بران کن کہ خریدارست
97 خطاے بزرگان گرفتن خطاست
98 چون حجت شد اعتدال مزاج
99 نہ عزیمت اثر کند نہ علاج
100 زن جوان را اگر تیرے در پہلو نشیند
بہ کہ پیرے
101 تو بجائے پدر چہ کردی خیر
102 تاہان چشم داری از پست

- 95 اسپ تازی دودگ رود بشاب
اُشتر آهسته میرود شب و روز
- 96 خر عیسی اگر بمکه رود
چون بیاید هنوز خر باشد
- 97 میراث پدر خواهی علم پدر آموز
98 اگر صد عیب دارد مرد درویش
رفیقانش یکے از صد ندانند
- وگر یک ناپسند آید ز سلطان
ز اقلیے به اقلیے رسانند
- 99 هر که در خردیش ادب نکند
در بزرگی فلاح از او برخاست
- 100 هر آن طفل کو جور آموزگار
نه بیند جفا بیند از روزگار
- 101 جور استاد به ز مهر پدر
102 چودخلت نیست خرج آهسته تر کن
103 کریمان را بدست اندر دم نیست
خداوندان نعت را کرم نیست
- 104 پراگنده روزی پراگنده دل
خداوند روزی بحق مشتغل
- 105 سگے را اگر کلوخے بر سر آید
ز شادی بر جهد کاین استخوان ست
- وگر نیشے دو کس بر دوش گیرند
لیم الطبع پندارد که خوان ست
- 106 هر جا که گلست خار ست
107 منت منه که خدمت سلطان همیکنم
منت شناس ازو که بخد مت بداشتت
- 108 نه محقق بود نه دانشمند
چار پائے برد کتابے چند
- 109 پیش دیوار انچه گوئی هوشدار
تا نباشد در پس دیوار گوش
- 110 همه کس عقل خود به کمال نماید و فرزند
خود بجمال
- 111 گراز بیط ز مین عقل منع دم گردد
بخود گمان نبرد هیچ کس که نادانم
- 112 که خبث نفس نگردد بسا لها معلوم
113 درشتی و نرمی بهم در به است
چورگ زن که جراح و مرهم نه است
- 114 مشک آنست که خود بوید نه که عطار بگوید
115 اندک اندک شود بهم بسیار
- 116 که بسیار خوار ست بسیار خوار
117 بر رسولان بلاغ باشد و بس
- 118 کهن چله خویش آراستن
باز چله عاریت خواستن

یہ تمام مقولے جو نقل کیے گئے ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو تحریر اور تقریر دونوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر تقریباً اسی قدر فقرے اور اشعار گلستان میں ایسے اور بھی ہیں جو محض تحریروں میں برتے جاتے ہیں وہ یہاں نقل نہیں کیے گئے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں گلستان اور بوستان شائع ہوئی ہیں وہاں زیادہ تر ان کا استعمال کم عمر اور بے استعداد لڑکوں کی تعلیم و تعلم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی لیے چھ سو برس سے شیخ کے یہ دونوں کارنامے برابر باز پچھڑاؤ اور دستخوش کودکاں رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس سن و سال کے لڑکوں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کی استعداد اور سمجھ اس قابل نہیں ہوتی کہ شیخ کی فصاحت و بلاغت کا جو کہ اُس نے ان کتابوں میں برتی ہے کچھ بھی اندازہ کر سکیں۔ لیکن چونکہ بچوں کا حافظہ عمدہ ہوتا ہے اس لیے کچھ کچھ فقرے یا اشعار ان کو یاد رہ جاتے ہیں۔ پس جس قدر گلستان اور بوستان کے فقرے اور اشعار بول چال میں ضرب المثل ہو گئے ہیں ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو لوگوں کو بچپن سے نوک زبان ہوتے ہیں اور جن کے مضمون سے وہ باوجود صغیر سن کے لذت یاب ہو چکے ہیں۔ ورنہ اگر یہ کتابیں بھی سکسپر ز کی طرح ایشیا کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے مطالعے میں رہتیں اور عورت اور مرد اور بوڑھے اور جوان سب لوگ ان کو دیکھا کرتے تو میں امید کرتا ہوں کہ گلستان کا ایک بڑا حصہ اور اُس سے کسی قدر کم بوستان کے اشعار جمہور کی زبان پر اسی طرح جاری ہو جاتے جیسے مذکورہ بالا فقرے اور اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کتابوں میں شیخ کا بیان اس قدر عام طبائع کے مناسب اور ہر فرقہ اور گروہ کی ضرورت اور مذاق اور اغراض کے موافق واقع ہوا ہے کہ ہر فقرے اور ہر شعر میں ضرب المثل ہونے کی قابلیت پائی جاتی ہے۔ ہمیشہ وہ اقوال ضرب المثل بنتے ہیں جن کا مضمون عام لوگوں کے حسب حال ہو۔ الفاظ سیدھے اور صاف ہوں اور انداز بیان میں کسی قدر لطافت پائی جائے۔ سو یہ خاصیت شیخ کے کلام میں عموماً اور گلستان بوستان میں خصوصاً پائی جاتی ہے۔

یہاں ہم گلستان کے متعلق بحث ملتوی کر کے کسی قدر بوستان کا حال لکھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی تقریباً اُسی قدر مقبول ہوئی ہے جس قدر گلستان اور اُس کی تعلیم بھی اکثر ملکوں میں اُسی طرح جاری ہے جیسے گلستان کی۔ مثنوی میں فردوسی کو عموماً تمام شعرا پر ترجیح دی گئی ہے اور

حقیقت میں رزم کا بیان باوجود نہایت سادگی اور صفائی کے جیسا موثر اور پُر جوش اُس کی قلم سے تراش کر تا ہے ایسا اور کسی سے بن نہیں آیا۔ لیکن مثنوی میں مطلقاً فردوسی کو سب سے افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جس طرح طعن و ضرب اور جنگ و حرب کا بیان فردوسی پر ختم ہے اسی طرح اخلاق نصیحت و پند، عشق و جوانی، ظرافت و مزاح، زہد و ریاضت وغیرہ کا بیان شیخ پر ختم ہے۔ شاہنامہ میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑتا ہے وہاں اُس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی عشقیہ مثنوی یوسف و زلیخا اس قدر مقبول نہیں ہوئی جس قدر شاہنامہ مقبول ہوا ہے۔ شیخ نے بوستان میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے میرے کلام کی بہت سی تحریف کرنے کے بعد مجھ پر یہ اعتراض کیا کہ اُس کو بہادری اور رزم کا بیان کرنا ویسا نہیں آتا جیسا کہ اور لوگوں کو آتا ہے یہ قصہ نقل کر کے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ”ہم کو لڑائی کا خیال ہی نہیں ہے ورنہ ہم کسی بیان سے عاجز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اپنی تیغ زبان کو میان سے نکال کر تمام دفتر شعر و سخن پر قلم پھیر دوں۔“ اس کے بعد ایک حکایت شاطر صفابانی کی جنگ تاتار کے ذکر میں لکھی ہے جس سے اپنا رزمیہ بیان دکھانا مقصود ہے اگرچہ شیخ کی شیریں زبانی اور فصاحت کا انکار نہیں ہو سکتا لیکن شاہنامہ کی نظم کے سامنے اس کا رنگ جننا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام محسوسات اور وجدانیاات کے مرغوب و نامرغوب ہونے میں الف و عادت کو بڑا دخل ہے۔ مرجع جس قدر عام ہندستانوں کو عادت مستمرہ کی وجہ سے مرغوب ہے اُسی قدر اکثر غیر ملک والوں کو خلاف عادت ہونے کے سبب نامرغوب ہے۔ اکثر عطر ہم کو خوشگوار اور غیر ملک والوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں اسی طرح لطیف شعر جو کہ ایک وجدانی امر ہے بغیر الف و عادت کے ہرگز محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً انیس و دہر کے مرعے جس پیرایے اور لباس میں مقبول ہوئے ہیں وہ پیرایہ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اُس کے بغیر مرثیہ مقبول ہونا مشکل ہے یعنی ضرور ہے کہ کچھ بند تلواریں اور کچھ گھوڑے کی تعریف میں لکھے جائیں۔ کچھ بند ایسے بھی ہوں جن سے خود مرثیہ گو کی تعلیٰ اور فوقیت اوروں پر ظاہر ہو۔ یہ بھی ضرور ہے کہ مرثیہ مسدس میں لکھا جائے اور مسدس انھیں بحروں میں سے کسی بحر میں ہو جو انیس و دہر نے اختیار کی ہیں۔ پس جن خصوصیتوں کے ساتھ شاہنامہ مقبول ہوا ہے اُن کے

بغیر کسی کی رزمیہ نظم مقبول نہیں ہو سکتی۔ ضرور ہے کہ خالص فارسی میں جو عربی الفاظ سے پاک ہو رزم لکھی جائے اور پیشار الفاظ جن میں فردوسی نے تصرف کیا ہے اور قیاس لغوی کے خلاف استعمال کیے ہیں کبھی کبھی قصداً اسی طرح برتے جائیں جیسے شاہنامے میں برتے گئے ہیں اور بے انتہا حشو و زوائد جن سے شاہنامہ بھرا ہوا ہے اشعار میں بہ تکلف داخل کیے جائیں۔ پس شیخ کی رزمیہ حکایت جو شیخ کے شاہنامے سے میل نہیں کھاتی اس کا یہی سبب ہے کہ شیخ نے ان باتوں میں سے کسی بات کا التزام نہیں کیا۔ فردوسی نے بھی یہی مگر اختیار کیا تھا جس سے اُس کی مثنوی مقبول ہوئی۔ دقتی نے جو فردوسی سے پہلے ہزار بیتوں میں گشتا سپ اور ارچاسپ کی داستان نظم کی تھی وہ سب کو پسند آچکی تھی۔ جب دقتی وہ داستان لکھ کر دفعۃً مر گیا اور فردوسی کی نوبت آئی تو اُس نے بھی وہی روش اختیار کی جو دقتی نے اختیار کی تھی۔ چنانچہ دقتی کی لکھی ہوئی داستان عام شاہناموں میں موجود ہے۔ دونوں کے کلام میں کوئی نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس حال سے واقف نہیں ہیں وہ اُس کو بھی فردوسی ہی کا کلام سمجھتے ہیں۔

فارسی میں چار مثنویاں ہیں جو شہرت اور قبولیت میں تقریباً تساوی الاقدام ہیں شاہنامہ، سکندر نامہ، مثنوی معنوی اور بوستان، شاہنامے اور مثنوی معنوی کو سکندر نامے اور بوستان سے وہ نسبت ہے جو ایک کامل خوشنویس کی بے ساختہ مشق کو اُس کے بنائے ہوئے اور مرتب کیے ہوئے قطعے سے ہوتی ہے۔ قطعہ اگر چہ رخ اور کرسی اور حروف کی نشست اور تقسیم وغیرہ کے لحاظ سے مشق کی نسبت بے عیب ہوتا ہے اور اُس کے اجزا میں پست و بلند کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور تمام حروف تقریباً ہموار اور یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر مشق میں بہت سی کششیں اور دوائر وغیرہ بے ساختہ اُس کے قلم سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اگر خوشنویس خود کو کشش کرے تو قطعے میں شاید ویسی کششیں اور دائرے نہ لکھ سکے یہی سبب ہے کہ خوشنویس لوگ اگلے استادوں کی مشق کو اُن کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ فردوسی اور مولانا روم نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامی اور سعدی کے الفاظ کی زیادہ تنقیح و تہذیب اور کانٹ چھانٹ نہیں کی مگر باوجود اس کے صد ہا مقامات اُن سے ایسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ تکلف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ہو سکتے۔

بوستان اور سکندر نامہ صرف اس لحاظ سے کہ دونوں کمال تنقید و تہذیب اور زحمت فکر و نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور دونوں میں صنعتِ شاعری کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ شاید ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ لیکن دونوں کے اندازِ بیان میں بہت بڑا تفاوت ہے سکندر نامے میں شاعرانہ مبالغہ، زورِ بیان، شوکتِ الفاظ، طُرکی استعارات، تنوعِ تمثیلات، ایک ایک مطلب نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا۔ ہر داستان کو ایک بڑی دھوم دھام کی تمہید کے ساتھ شروع کرنا اور اسی طرح کی اور شاندار باتیں پائی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے بوستان میں نہایت سادگی، الفاظ کی نرمی اور گھلا ہٹ، ترکیبوں کا سلجھاؤ، بیان کی صفائی، عبارت کی دلنشینی، خیالات کی ہمواری، مبالغہ میں اعتدال، ماخذ میں سہولیت، حسن ترتیب، لطیف ادا، تمثیلات کی برجستگی، استعارات کی لطافت، کنایات کی شوخی، باوجود صنعتِ شاعری کے نہایت بے تکلفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔

مثلاً اس مطلب کو کہ زمین میں خدا کی بے انتہا مخلوق دبی ہوئی ہے۔ مولانا نظامی سکندر نامے میں اس طرح ادا کرتے ہیں۔

فلک در بلندی زمین در مفاک یکے طشت خون شد یکے طشت خاک
بشتہ برین ہر دو آلودہ طشت ز خون سیاوش بے سر نوشت
زمین گر بضاعت برون آورد ہمہ خاک در زیر خون آورد
یہی مطلب سکندر نامے میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

کہ داند کہ این دشمہ دام و دد چہ تاربخنا دارد از نیک و بد
چہ نیرنگ با بخردان ساخته است چہ گردن کشان را سر انداختہ است
شیخ نے اسی مطلب کو بوستان میں یوں بیان کیا ہے۔

زدم تیشہ یک روز بر تل خاک بگوش آدم نالہ دردناک
کہ زنہار گر مردی آہستہ تر کہ چشم و بنا گوش درویش و سر
یہی مطلب بوستان میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

درین باغ سروے نیام بلند کہ باو اجل بخش از بن بکند
عجب نیست بر خاک اگر گل شکفت کہ چندین گل اندام در خاک خفت

قناعت کی ترغیب سکندر نامے میں اس طرح دی ہے۔

تو نیز ار نہی بار گردن ز دوش ز گردن کشان بر نیاری خروش
چو دریا برمایہ خویش باش ہم از بود خود سود خود بر تراش
بہمانی خویش تا روز مرگ درختے شو از خویشتن ساز برگ
چو پیلہ ز برگ کسان خورد گاز ہمہ تن شد انگشت و قے کرد باز

بوستان میں یہی مطلب اس طرح ادا ہوا ہے۔

شنیدم کہ در روزگار قدیم چو قانع شدی سیم و سنگت یکیت
مندیاری این قول معقول نیست چو مشیت زرش پیش وچہ مشیت خاک
چو طفل اندرون دارد از حرص پاک کہ سلطان زدرویش مسکین ترست
خبر ده بدرویش سلطان پرست فریدون بملک عجم نیم سیر
گدا را کند یکدم سیم سیر بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست
گدائے کہ بر خاطرش بند نیست بذوقے کہ سلطان در ایوان نخفت

مال اندیشی اور پیش بینی کی نصیحت سکندر نامے میں اس طرح کی گئی ہے۔

میفکن گول گرچہ عار آیدت کہ ہنگام سرما بکار آیدت
خرے بر گریوہ ز تختی بُرد کہ از کابلی جلن با خود نبرد
یہی مضمون بوستان میں اس طرح ادا کیا گیا۔

بہ دختر چہ خوش گفت بانوی ده کہ روزِ نوا برگِ تختی بنہ
ہمہ وقت پُر دار مشک و سبوی کہ پیوستہ درده روان نیست جوے

سکندر نامے میں عہد شباب پر تحسّر اس طرح کیا گیا ہے۔

جوانی شد و زندگانی نماند جہان گو ممان چون جوانی نماند
جوانی بود خوبی آدمی چو خوبی رود کے بود خرمی
چو پے ست و بوسیدہ شد استخوان دگر قصہ خوبوئی مخوان
غرور جوانی چو از سر گذشت ز گستاخ کاری فرد شوی دست

نہی چہرہ باغ چندان بود کہ شمشاد با لاله خندان بود
 چو باد خزانہ در افتد باغ زمانہ دہد جائے بلبل بہ زانغ
 بود برگ ریزان چو شاخ بلند دل باغبان زان شود دردمند
 ریامین ز بُستان شود ناپدید در باغ را کس نجوید کلید
 بنال اے کھن بلبل سال خورد کہ رخسارہ سرخ گل گشت زرد
 دوتا شد سہی سرو آراستہ کدیور شد از باغ برخاستہ
 چو تاریخ پنجہ درآمد بسال دگرگونہ شد بر شتابندہ حال
 سر از بارنگی درآمد بستگ حمازہ بہ تنگ آمد از راہ تنگ
 فروماند دستم ز مے خواستن گران گشت پایم ز برخاستن
 تنم گوئہ لاجوردی گرفت کلم سُرخِ انداخت زردی گرفت
 ہیون رونندہ زرہ ماند باز بہالین گہ آمد سرم را نیاز
 ہمان بور چو گانی باد پایے بعد زخم چو گان نہ جبذہ ز جایے
 طرب را ز میخانہ گم شد کلید نشان پشیمانی آمد پدید
 بوستان میں یہی مضمون ایک حکایت کی ضمن میں اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

چو باد صبا بر گلستان و زد حمیدن درخت جوان را سزد
 حمد تا جوان ست و سرسبز و خید شکستہ شود چون بہ زردی رسید
 بہاران کہ بار آورد بید مشک بریزد درخت کھن برگ خشک
 نہ نید مرا با جوانان حمید کہ بر عارضم صبح پیری دمد
 بقید اندرم جرہ بازے کہ بود دمام سر رشتہ خواہد ربود
 شمارست نوبت برین خوان نشست کہ ما از ہمعم ہشتیم دست
 چو بر سر نشست از بزرگی غبار دگر چشم عیش جوانی مدار
 مرا برف بارید بر پر زانغ نشاید چو بلبل تماشایے باغ
 کند جلوہ طاووس صاحب جمال چہ میخوای از باز برکنندہ بال
 مرا غلہ نیک آمد اندر درو شتا را کنون میدم سبزہ نو

گلستان ما را طراوت گذشت
مرا تکیہ جان پدر بر عصا ست
مسلم جوان راست بر پائے جست
گل سرخ رویم نگر ز زتاب
ہوس بخشن از کودک تا تمام
مرا مے باید چو طفلان گریست
نکو گفت لقمان کہ تا زیستن
ہم از با مداوان در کلبہ بست
جوان تا رساند سیاہی بنور
کہ گلدستہ بند چو پژمرده گشت
دگر تکیہ بر زندگانی خطا ست
کہ پیران برند استعانت بدست
فرو رفت چون زرد شد آفتاب
چنان زشت نبود کہ از پیر خام
ز شرم گناہان، نہ طفلانہ زیست
بہ از سالہا بر خطا زیستن
بہ از سود و سرمایہ دادن ز دست
بزد پیر مسکین سپیدی بگور

مذکورہ بالا مثالوں کے ملاحظے سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ کے خیالات ہمیشہ ہل الماخذ ہوتے ہیں۔ وہ معنی مقصود کو ایسی تمثیلوں میں بیان کرتا ہے جو ہمیشہ خاص و عام کے مشابہے میں آتی ہیں۔ بخلاف مولانا نظامیؒ کے کہ اُن کے خیالات اور تمثیلات اکثر غرابت اور ندرت سے خالی نہیں ہوتیں۔

شیخ نے جو شاعر صفاہانی کی حکایت میں اپنا رزمیہ بیان دکھایا ہے اگرچہ بے تکلفی اور سادگی میں فردوسیؒ کے بیان سے نہیں ملتا لیکن مولانا نظامیؒ کی رزم سے جس میں سادگی کی نسبت شاعری کا زیادہ لطف ہے بہت مشابہت رکھتا ہے چند شعر اس حکایت کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار سکندر نامے کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں۔

سکندر نامہ

دو لشکر چو مور و ملخ تا خمد
نبرد جہان در جہان ساحمد
بشمیر پولاد و تیر خدنگ
گذرگاہ بر مور کردند بنگ
کند اژدہاے مسلسل شکنج
دہن باز کردہ بتاراج گنج

بوستان

دو لشکر بہم برزدند از کمین
تو گشتی زدند آسمان بر زمین
ز باریدن تیر ہچون نگرگ
بہر گوشہ برخاست طوفان مرگ
بھید ہزبران پُر خاش ساز
کند اژدہاے دہن کردہ باز

زمین آسمان شد ز گرد کپود | زمین کو بساطے بُد آراستہ
 چو انجم درو برق شمشیر مہ خود | غبارے شد از جاے برخاستہ
 چو ابر اسپ تازی بر انجم | براگنجت رزے چو بارندہ منج
 چو باران پلارک فرو رختیم | نگر گش ز پیکان و باران ز تیغ

مگر حق یہ ہے کہ ایک دو حکایت کے ملا دینے سے مساوات اور برابری کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ رزم میں فردوسی اپنی جگہ اور نظامی اپنی جگہ فی الحقیقت اپنا مثل نہیں رکھتے۔

شیخ علی حزیں نے جس کو ہندستان میں خاتم الشعرا سمجھتے ہیں بیس بائیس صفحے کی ایک مثنوی جس کا نام خرابات ہے بوستان کی طرز میں لکھی ہے اور اپنی عادت کے موافق اُس پر بہت کچھ انفاخر کیا ہے چنانچہ مثنوی کے خاتمے میں فرماتے ہیں۔

خن خن گر ہست ہشمار مغز | کند قوت جان این گہر ہائے فقر
 ازین نامہ گردون پُر آوازہ شد | روانِ خن گستران تازہ شد
 نوائے کہ این خامہ بنیاد کرد | دلِ طوی رودکی شاد کرد
 بگوشِ نظامی اگر میرسید ق | سرودے ازین خسروانی نشید
 یہ تعظیم من رُخ نہادی بخاک | کہ احسنت اے نیر تابناک
 وگر سحری شہد پرور ادا ق | شنیدے ز صور نے من نوا
 سماعش ز سر عقل بردے و ہوش | زبان مہر کردے شدے جملہ گوش

معلوم ہوتا ہے کہ علی حزیں نے اپنے نزدیک اس مثنوی میں بوستان کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور وہ اُس کو اپنے لیے ایک سرمایہ نازش سمجھتا تھا۔ سوانح عمری میں اسی مثنوی کی نسبت لکھتا ہے کہ ”بیارے از مطالب عالیہ و سخنان دلپذیر در آن کتاب بسک نظم درآمد“ مگر دونوں کتابوں یعنی بوستان اور خرابات کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک شکل کی ہیں۔ ایک جاندار دوسری بے جان، لفظ اچھے، بیان اچھا، مطالب عمدہ، یہ سب کچھ سہی۔ مگر شیخ کے بیان میں ایک چمچا ہوا جادو ہے جو بوستان کو خرابات سے بالکل الگ کر دیتا ہے۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے دونوں کا فرق بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ قحط کا بیان ایک جگہ بوستان میں بھی کیا گیا ہے اور خرابات میں بھی اتفاق سے یہ مضمون نکل آیا ہے۔ ہم دونوں

کے اشعار اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور فرق جو دونوں کے طرز بیان اور طریقہ ادا میں ہے اُس کو بھی کسی قدر بیان کریں گے۔

خرابات	بوستان
<p>شنیدم کہ در عہد بہرام گور نمود از قضا قحط سالے ظہور چو صحراے محشر زمین تف گرفت بہ دریوزہ آسمان کف گرفت سحاب سیہ دل نشد مہربان بحال لب تشنہ خاکیان بخیلی نمود ابر بر کائنات بہمد زمین سوخت طفل نبات ز خشکی در اندام خاک دوتوہ عروق شجر شد چو رگہای کوہ ز تاب فروزندہ مہر بلند زمین مجر و دانہ بودش سپند بطے چو پستان بے شیر شد ز خشکی چو پیکان گلو گیر شد</p>	<p>چناں قحط سالے شد اندر دشت کہ یاران فراموش کردند عشق چناں آسمان بر زمین شد بخیل کہ لب تر کردند زرع و خیل بخوشید سر چشمہای قدیم نماند آب جز آب چشم یتیم نبودے بجز آہ بیوہ زنے اگر بر شدے دودے از روزنے چو درویش بے برگ دیدم درخت قوی بازوان ست و در ماندہ سخت نہ بر کوہ سبزی نہ در باغ شخ ملخ بوستان خورد و مردم ملخ</p>

شیخ سعدی نے پہلے ہی شعر کے دوسرے مصرعے میں جس حسن و لطافت کے ساتھ قحط کی سختی کی تصویر کھینچی ہے اس سے بہتر کوئی اسلوب بیان خیال میں نہیں آتا۔

قحط کی شرح ایک کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتی جیسی اس ایک مصرعے میں ہوئی ہے ”کہ یاران فراموش کردند عشق“، سہل و ممتنع کا لفظ جو اکثر بولا جاتا ہے وہ اسی قسم کے بیان کو کہتے ہیں کہ بادی النظر میں نہایت سرسری معلوم ہو مگر وہی مطلب دوسری بار کسی سے بلکہ خود مصنف سے بھی دیا بیان نہ ہو سکے۔ اس بیان میں لطف یہ ہے کہ قحط کے بیان کے جتنے معمولی اسلوب ہیں یہ اسلوب اُن سب سے علیحدہ ہے قحط کی سختی ہمیشہ اس طرح بیان کی

جاتی ہے ”ایسا قحط پڑا کہ روٹی جان سے زیادہ عزیز ہو گئی، آدمی بھوک میں آدمیوں کو کھا گئے۔ ماں باپ نے ایک ایک روٹی کے بدلے اولاد کو بیچ دیا۔ لاکھوں جاندار بھوکے مر گئے۔ غرضیکہ تمام بیان ایسے ہوتے ہیں جن سے غلہ کی گرانی، پانی کی نایابی، بھوک کی تکلیف اور اسی قسم کی باتیں سمجھی جائیں۔ شیخ نے وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو سب سے نرالا اور سب سے بلیغ ہے۔ اس اسلوب سے اُس کو یہ جتنا مقصود ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق ایک ایسی چیز ہے جو کسی حالت میں فراموش نہیں ہوتی۔ باوجود اس کے لوگ اُس کو بھول گئے تھے۔ اور یاران کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ مصنف بھی اُسی عشاق کے جرگے میں تھا۔ دوسرے شعر کا صرف یہ مطلب ہے کہ مینہ نہ برسا تھا۔ مگر اُس کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے۔ تیسرے شعر میں پانی کا نایاب ہونا اور پھر یتیم کے آنسو کو اُس سے مستثنیٰ کرنا۔ چوتھے شعر میں کسی گھر کے روزن سے باورچی خانہ کے دھوئیں کا نہ ٹکنا اور پھر اُس سے رائٹوں کی آہ کے دھوئیں کو مستثنیٰ کرنا۔ پانچویں شعر میں درختوں کو بے برگگی میں قحط زدہ درویشوں اور مسکینوں سے تشبیہ دینا اور قوی پہلوانوں کا بے بس اور عاجز ہو جانا یہ تمام اسلوب کس قدر لطیف اور دلکش ہیں۔ چھٹا شعر بلاغت اور حسن بیان میں تقریباً ویسا ہی اعلیٰ درجے کا ہے جیسا پہلا۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے کوئی بات ایسی نہیں جو نیچر یا عادت کے خلاف ہو۔ قحط میں عشق کے ولولوں کا نیست و نابود ہو جانا، درختوں کا سرسبز نہ ہونا، چشموں اور ندیوں کا خشک ہو جانا، یتیموں کا رونا، گھروں میں کھانا نہ پکنا، بے دارث رائٹوں کے آہ و تالے، درختوں کا بے برگ و بار اور غریبوں کا بے سروسامان ہونا، پہلوانوں اور زبردستوں کا درماندہ ہو جانا، پہاڑ اور جنگل میں سبزہ اور ہریادوں کا نہ رہنا، مٹیوں کا باغ اور کھیتی کو اور آدمیوں کا مٹیوں کو کھانا، یہ سب باتیں ایسی ہیں جو قحط کے زمانے میں اکثر کم و بیش ظہور میں آتی ہیں۔

حزب نے باوجود اس کے کہ خرابات جو چند اوراق سے زیادہ نہیں ہے بوستان سے پانچ سو برس بعد لکھی ہے اور جیسا کہ اُس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے اپنی پوری طاقت شیخ کے تتبع میں صرف کی ہے کوئی کرشمہ اُس کی مثنوی میں ایسا نہیں پایا جاتا جس کو دیکھ کر جی بے اختیار پھڑک اٹھے۔

پہلا شعر ہموار اور صاف ہے اُس میں کوئی خوبی قابل ذکر نہیں۔ دوسرے شعر میں

زمین تفتہ کو صحراے محشر سے تشبیہ دینا تعریف الہی بالمجہول کے قبیل سے ہے یعنی ایک ایسی تمثیل ہے جو اہل دنیا کی نظر میں قحط کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے۔ صحراے محشر اور تمام اعتقادات خود تمثیل کے محتاج ہیں اُن پر قیاس کرنے سے کسی شے کی حقیقت نہیں کھل سکتی۔ تیسرا شعر بوستان کے اُس شعر سے ماخوذ ہے جو ذوالنون مصری اور مصر کے قحط کے بیان میں شیخ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے۔

خبر شد بہ مدین پس از روز بیست کہ ابر سیہ دل بر ایشان گریست
مگر اتنا فرق ہے کہ شیخ نے ابر کے برسنے کو ابرونے سے تعبیر کیا ہے جس سے ترحم اور برسانوں باتیں نکلتی ہیں اور حزیں نے برسنے کو مہربان ہونے سے تعبیر کیا ہے جس سے دونوں معنی ویسے صاف نہیں نکلتے۔ چوتھا شعر شیخ کے اس شعر سے ماخوذ ہے

چنان آسمان بر زمین شد بخیل کہ لب تر نکردند زرع و نخیل
مگر شیخ کے بیان میں اتنا لطف زیادہ ہے کہ کھڑی کھیتی کا خشک ہو جانا زیادہ حسرت ناک ہے۔ یہ نسبت اُس کے کہ تخم زمین کے اندر ہی جل جائے۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہت عمدہ مگر پہلا مصرعہ تکلف سے خالی نہیں۔ شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ زمین کی خشکی کے سبب درختوں کی رگیں پہاڑ کی رگوں کی طرح سوکھ گئی تھیں۔ پس اندام اور دو توبہ کے لفظ کو افادہ معنی میں کچھ دخل نہیں ہے۔ چھٹے شعر میں صرف یہ بیان ہے کہ آفتاب کی گرمی سے زمین انگیکٹھی کی طرح جلتی تھی اور تخم جو اُس پر ڈالا جاتا تھا وہ سپند کا حکم رکھتا تھا۔ پس فروزندہ اور باز جود دو صفتیں مہر کی واقع ہوئی ہیں اُنھوں نے کچھ فائدہ نہیں دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ فروزندہ مہر کہنے سے آفتاب کی گرمی کا زیادہ ثبوت ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ مہر بلند کہنے سے اُس کی گرمی کا خیال کم ہو جاتا ہے اور ایسی دو متضاد صفتیں لانی بلاغت کے خلاف ہیں۔ ساتویں شعر کا مضمون بالکل خلافِ عادت اور خلافِ مقتضای مقام ہے۔ نہ قحط کا یہ خاصہ ہے کہ شراب کی صراحی کو خشک کر دے اور نہ صراحی کا خشک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قحط کی شدت ہو رہی ہے۔

یہ جو کچھ ہم نے بطور محاکمے کے لکھا ہے اس سے خان آرزو کی طرح شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنی ہمارا مقصود نہیں ہے اور نہ بوستان کو خرابات سے افضل ثابت کرنا مد نظر ہے

کیونکہ نہ ہم شیخ علی حزیں پر حرف گیری کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور نہ بوستان کے افضل ہونے میں کسی کو شبہ ہے بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ کوئی شے فی نفسہ کیسی ہی بے عیب ہو جب وہ کسی ایسی شے کے مقابلے میں لائی جاتی ہے جو اُس سے براتب افضل اور فائق ہو تو اُس میں بیسیوں فروگزاشتیں اور قصور نظر آنے لگتے ہیں اگر خرابات بوستان کے جواب میں نہ ہوتی اور حسن اتفاق سے ایک مضمون کی حکایتیں دونوں مثنویوں میں نہ نکل آتیں تو حزیں کے بیان میں چون و چرا کرنے کا ہم کو خیال بھی نہ آتا کیونکہ یہ باتیں تقریباً تمام شعرا کے ہاں عامۃً الورد ہیں۔

اب ہم گلستان اور بوستان کی چند خاصیتیں ایسی بیان کرتے ہیں جو دونوں کتابوں میں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں اور جن کو ان کے مقبول ہونے میں بہت بڑا دخل ہے۔
مثالوں کی جہاں ضرورت ہوگی کہیں صرف گلستان سے اور کہیں صرف بوستان سے اور کہیں دونوں سے نقل کی جائیں گی۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ان میں سر تا پا اخلاق اور تہذیب نفس کے مضامین مندرج ہیں مگر میرے نزدیک ان کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اخلاق اور مواظع کو شیخ کے سوا کسی نے ایسی خوبی اور لطافت کے ساتھ فارسی زبان میں بیان نہیں کیا اخلاق میں بیسیوں کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں اور اب تک موجود ہیں اور غالباً گلستان اور بوستان میں کوئی پند و نصیحت ایسی نہ ہوگی جو اوروں نے نہ لکھی ہو مگر کوئی کتاب ان دونوں کتابوں کے برابر مقبول نہیں ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قبول عام کا مدار زیادہ تر حسن بیان اور لطیف ادا پر ہے نہ کہ نفس مضامین پر۔ البتہ مضامین کو بھی شہرت اور قبولیت میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لیے جو محاسن ان کتابوں کے ہم آگے لکھنے چاہتے ہیں وہ کسی قدر مضامین سے اور زیادہ تر حسن معنی اور اسلوب بیان سے متعلق ہوں گے۔

(1) سب سے زیادہ تعجب انگیز بات ان دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ جن باتوں میں مشرقی لٹریچر عموماً بدنام ہے وہ ان کتابوں میں اس قدر کم ہیں کہ چند مقامات مستثنیٰ کرنے کے بعد کوئی ایسی بات باقی نہیں رہتی جو زمانہ حال کے مورل اور سوشل خیالات کے برخلاف ہو۔ اور یہ امر ایسی پُرانی کتابوں میں جن کے زمانہ تصنیف کو ساڑھے چھ سو برس سے زیادہ گزر

چکے ہیں کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے مثلاً مبالغہ اور اغراق جو مشرقی انشا کا خاصہ ہے ان کتابوں میں اتنا کم ہے جتنا ایران کے اور شعرا کے کلام میں سچ اور جہاں ہے وہاں نہایت لطیف اور بامزاح ہے اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں مثلاً شیخ بوستان میں کہتا ہے

میانِ دو کس دشمنی بود و جنگ سر از کبر بر یکدگر چون پلنگ
ز دیدار ہم تا بحدّے رمان کہ بر ہر دو تنگ آمدے آسمان

دوسری بیت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے ایسے بیزار تھے کہ جب کبھی راہ میں دو چار ہو جاتے تھے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رستے سے اُلٹے ہٹ جاتے تھے اور اُس وقت کمالِ نفرت سے اُن کا جی چاہتا تھا کہ آسمان جو سامنے حائل نظر آتا ہے اُس کو توڑ کر نکل جائیں۔ یہ مبالغہ جیسا کہ بادی النظر میں بڑا معلوم ہوتا ہے فی الحقیقت ایسا نہیں ہے کیونکہ نفرت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کا کوئی اندازہ اور پیمانہ مقرر نہیں ہے۔ پس جس طرح ادنیٰ درجے کی نفرت یہ ہے کہ دو دشمن ایک مجلس میں اکٹھا ہونا پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح اجتہاد درجے کی نفرت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عالم میں رہنا پسند نہ کریں۔

اسی طرح شیخ کی نظم و نثر میں جہاں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے لطافت سے خالی نہیں ہوتا مثلاً گلستان میں ایک دولت مند بخیل کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں۔ دو مالدارے راشنیم کہ بہ بخل چنان معروف بود کہ حاتم طائی بہ سخاوت۔ ظاہر حاش بہ نعت دنیا آراستہ و خست نفس در نہادش بچنان متمکن۔ تا بجائیکہ تانے را بجانے از دست ندادے و گریہ ابو ہریرہ را بہ لقمہ نواختے و سبک اصحاب کھف را استخوانے نینداختے۔ فی الجملہ کسے خانہ اور اندیدے در کشادہ و سفرۂ اور اسر۔

بیت

دردیش بجز بوی طعاش نشیدے مُرغ از پس نان خوردن اور پڑھ نچیدے
ایک اور جگہ سمندر کی موج اور طوفان کا بیان اس طرح کیا ہے۔ ”سہلکین آبے کہ مرغابی دردایمن نبودے“ اگر غور سے دیکھئے تو حد سے زیادہ مبالغہ ہے۔ مگر بادی النظر میں کوئی ناممکن بات نہیں معلوم ہوتی۔

سو پر نیچرل یعنی فوق العادۂ باتیں اور عجیب و غریب قصے بھی جن سے قدیم اور متوسط

زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہوا ہے ان کتابوں میں بہت کم ہیں۔ تمام گلستان اور بوستان میں صرف دو تین حکایتیں ایسی ہیں جو اس زمانے میں مستبعد معلوم ہوتی ہیں اور تاویل کے بعد اُن میں بھی کچھ استبعاد باقی نہیں رہتا۔

علم اخلاق کے بعض اصول جن میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور اب بھی چلا جاتا ہے اگر کسی کتاب میں زمانہ حال کے فلسفہ مسلّمہ کے برخلاف ہوں تو اُس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسی کوئی کتاب نہیں ہو سکتی جس کی سب باتوں پر تمام عالم کا اتفاق ہو۔ مثلاً شیخ کے اس فقرے پر کہ ”دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز“ اکثر مشنری لوگ یہ کہتے ہیں کہ جھوٹ کیسا ہی مصلحت آمیز ہو سچ کے برابر یا سچ سے بہتر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس بحث کے متعلق ہمارے ایک دوست نے نہایت دلچسپ قصہ نقل کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک علمی سوسائٹی میں چند یوروپین عالم اور مشنری موجود تھے۔ راستی اور دروغ پر ایک مضمون پڑھا گیا۔ جس میں گلستان کے فقرہ مذکورہ کی تائید کی گئی تھی۔ ایک پادری صاحب نے کہا کہ مضمون عمدہ ہے مگر جس قدر اس فقرے کی تائید میں لکھا گیا ہے اُس میں سے نکال دینا چاہیے۔ اس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ آخر ہمارے دوست جو اس قصے کے راوی ہیں انھوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ اس بحث کا محاکمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے تو بیشک جھوٹ بولنا کسی حالت میں جائز نہیں لیکن اگر جھوٹ سے کسی مظلوم کی جان بچتی ہو تو ایسی حالت میں جھوٹ بولنا بیشک سچ بولنے سے بہتر ہے اس کے بعد انھوں نے یہ مثال دی کہ 1857ء میں جو اکثر لوگوں نے رحم اور انسانی ہمدردی کی راہ سے یوروپین عورتوں اور بچوں کو غلاموں اور بے رحموں کی شر سے بچانے کے لیے اپنے گھروں میں چھپا لیا تھا اور باغی لوگ اُن کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ایک ایک سے اُن کا حال پوچھتے تھے ایسی حالت میں جھوٹ بول کر اُن بے گناہوں کو خطرے سے بچانا بیشک سچ بولنے سے بہتر تھا۔ اس تقریر کو تمام مجلس نے پسند کیا اور وہ فقرہ سب کے اتفاق سے مضمون میں بحال رکھا گیا۔ مذکورہ بالا توجیہ کی تائید خود شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اُس نے گلستان کے آٹھویں باب میں اپنے ذاتی اغراض کے لیے جھوٹ بولنے کو بہت بُرا بتایا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے

گر راست سخن گوئی و در بند بمانی بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ ”صورت مفروضہ میں بھی مقتضائے جو انمردی یہی ہے کہ جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ ظالموں کا مقابلہ کر کے اپنے تئیں اُن مظلوموں پر ثار کیا جائے جب اپنے میں سے کوئی باقی نہ رہے تب اُن مظلوموں کی باری آئے تو آئے۔“ لیکن ہمارے نزدیک جیسی تک جو انمردی ہے کہ ظالموں کے مقابلہ کرنے یا اپنی جان پر کھیلنے سے اُن بے گناہوں کی جان بچ جانے کا یقین کامل ہو ورنہ یہ حرکت تہور اور نادانی اور سفاہت میں شمار ہوگی۔ اسی طرح شیخ کے اس شعر کے مضمون پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے۔

شمیر نیک زآہن بد چون کند کسے ناکس بتر بیت نشود اے حکیم کس

کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور قانون و مذہب اور تمام سیاستیں عبث اور فضول اور بے کار ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کہ تعلیم سے انسان کی جبلت بدل جاتی ہے یا نہیں۔ علم اخلاق کے اُن مسائل میں سے ہے جن کا آج تک کسی قطعی دلیل سے فیصلہ نہیں ہوا۔ انگلستان کے ایک روشن ضمیر مورخ کی رائے ہے کہ حال کی سولیزیشن نے انسان کے اخلاق پر اس کے سوا کچھ اثر نہیں کیا کہ گناہوں کی صورتیں اور نام بدل گئے ہیں مگر گناہ بدستور موجود ہیں پہلے زمانے میں بیشک گناہ بہت سخت اور شدید اور صریح ہوتے تھے لیکن بہت کم ہوتے تھے اور اب اگرچہ ویسے شدید اور سخت گناہ نہیں ہوتے لیکن نہایت کثرت سے ہوتے ہیں اور چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بھی انسان اپنی جبلت سے نہیں ملتا۔

ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ ”یہودی کیسا ہی دولت مند ہو جائے شریف نہیں ہو سکتا“ فی الواقع اس سے کمال تعصب پایا جاتا ہے مگر اس پر کوئی مہذب سے مہذب بھی اعتراض نہیں کر سکتا ہر قوم اپنی حکومت کے زمانے میں محکوم قوم کو ایسا ہی سمجھتی رہی ہے آریا نے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو اس سے بھی زیادہ حقیر سمجھا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے دور میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھا اور انگریز بھی بایں ہمہ شائستگی و تہذیب، نوٹلٹی یا شرافت کو اپنی ہی قوم کے ساتھ مخصوص جانتے ہیں۔

ایک اور جگہ گلستان میں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک مریض بادشاہ کے لیے چند حکماء یونان نے آدمی کا پتہ جو خاص صفات سے موصوف ہو تجویز کیا تھا مگر تجربے کی نوبت

نہیں آئی یہ بات حال کی تحقیقات کے برخلاف بتائی جاتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر شیخ اس اعتراض سے بری ہے اس کا الزام جو کچھ ہے مجوزین پر ہے۔ نہ اُن کی تجویز کے راوی پر۔ شیخ پر البتہ اُس صورت میں اعتراض ہو سکتا تھا کہ وہ اُن کی تجویز کو پسند کرتا۔ یا یہ لکھتا کہ اُس سے بادشاہ کو شفا ہو گئی۔ یا جو فرض معلمین اخلاق کا ہے (یعنی ہر قصے اور افسانے سے ایک مفید نتیجہ استخراج کرنا) اُس سے عہدہ برآ نہ ہوتا۔

بعض ملّا یا نہ اعتراض بھی شیخ کے کلام پر سُنے گئے ہیں۔ مثلاً اُس نے گلستان میں کہا

ہے

رہ راست برو اگر چہ دورست زن بیوہ مکن اگر چہ حورست

اس پر بعض حضرات یہ نقص وارد کرتے ہیں کہ جس امر کی اجازت شریعت سے پائی جاتی ہے اُس سے منع کرنے کے کیا معنی۔ اور بعضے کٹ ملّا بیوہ کی جگہ بیوہ¹ بتاتے ہیں جس کے معنی اُنھیں کو معلوم ہیں یہ ویسا ہی اعتراض ہے جس پر کسی نے کہا تھا ”شعر مراد بر سرہ کہ برد“ ظاہر ہے کہ شیخ کی کتاب گلستان کوئی فقہ کا فتاویٰ نہیں ہے کہ جس کی ہر امر و نہی کو ہر امر و نہی مصطلح فقہ پر محمول کیا جائے وہ اکثر اپنے تجربے اور رائے کے موافق جس بات کو بنی نوع کے حق میں مفید سمجھتا ہے اُس کی ترغیب دیتا ہے اور جس کو مضر سمجھتا ہے اُس سے منع کرتا ہے۔ گو فقہانے اُس کو مباح لکھا ہو۔ کیونکہ مباحات میں فعل اور ترک دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے رہی یہ بات کہ شیخ کی رائے فی نفسہ کیسی ہے۔ سو حدیث نبوی سے بھی ابکار کی ترجیح ثبات پر ثابت ہوتی ہے۔

(2) سب سے زیادہ معقول اعتراض بوستان کی اُس حکایت پر وارد ہوتے ہیں جس میں شیخ نے سومات کا قصہ لکھا ہے مگر ہم نے اُس کی بابت پہلے باب میں کچھ عذر لکھے ہیں جن سے اعتراض کسی قدر ہلکے ہو سکتے ہیں۔

امرد پرستی کا ذکر جو ان کتابوں میں اکثر آتا ہے یہ بھی سخت اعتراض کے قابل بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس باب میں جو کچھ ہم نے خاتمہ کتاب میں لکھا ہے وہ شاید ان اعتراضوں کے فیصلے کے لیے کافی ہو۔

1- بیوہ کے معنی لغت میں متجدد اور متغیر ہونے کے لکھے ہیں جو اس شعر میں کسی طرح چپاں نہیں ہو سکتے۔

ایسے ایسے اعتراضوں سے بجائے اس کے کہ ان کتابوں کی قدر و قیمت میں فرق آئے اور زیادہ اُن کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ کپڑا جس قدر اُجلا ہوتا ہے اُسی قدر جلد ذرا سے دھبے سے میلا ہوتا ہے۔ ان کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ کتابیں ساڑھے چھ سو برس سے برابر تعلیم میں داخل رہی ہیں اور آج کل بھی کہ نہایت نکتہ چینی کا زمانہ ہے اُسی طرح مشرقی سلسلہ تعلیم کا جزو اعظم ہیں اُن کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک مصرعے کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے مشنریوں نے صرف اُس وجہ سے کہ ان میں مسلمانوں کی مذہبی باتیں بہت ملی ہوئی ہیں اور ایسے مضامین کا سلسلہ تعلیم میں داخل رہنا مشن کے مقاصد کے خلاف ہے۔ ان پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے بڑے بڑے طولانی رپورٹ لکھ کر چھپوائے ہیں۔ نیز اس لحاظ سے کہ ان کتابوں کو زیادہ تر صغیر سن بچے پڑھتے ہیں اور بھی زیادہ چھان بین کی گئی ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے ایسے چند سرسری اعتراضوں کا وارد ہونا جیسے کہ اوپر ذکر کیے گئے اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بلاشبہ اس قدر بے عیب ہیں جس قدر کہ زمانہ متوسط میں انسان کا کلام بے عیب ہو سکتا تھا۔

دوسری عام اور بڑی خوبی جو ان کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے وہ شیخ کا انداز بیان ہے جس کا ملکہ اُس کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ یہ بات نہ قواعدِ علمِ بلاغت کی پابندی سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کسی استاد کی تعلیم سے آتی ہے بلکہ جس طرح حسن صورت اور حسن صوت قدرتی خوبیاں ہیں اُسی طرح حسن بیان بھی ایک جبلتی خاصہ ہے جس میں اکتساب کو چنداں دخل نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی کمی اور زیادتی پر شاعری کا نقصان اور کمال موقوف ہے۔ جو مطلب اُس کو بیان کرنا ہوتا ہے اُس کے لیے وہ ایسا دلکش اور لطیف پیرایہ ڈھونڈ لاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔ مثلاً عربی میں ایک قول مشہور ہے ”الصمت زينة العالم وستر الجاهل“ (یعنی خاموشی عالم کی زینت ہے اور جاہل کی پردہ پوش) اس مطلب کو وہ شعر میں اِس طرح بیان کرتا ہے۔

ترا خامشی اے خداوند ہوش وقارست ونا اہل را پردہ پوش

اگر عالمی ہیبتِ خود مبر وگر جاہلی پردہ خود مذر

یا مثلاً اُس کو بیان کرنا ہے کہ جو لوگ نصیحت نہیں سنتے وہ آخر کو بچھتاتے ہیں یا زک

اُٹھاتے ہیں۔ اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے ”ہر کے نصیحت نشو و نما مت شنیدن دارد“ یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرتا ہے کہ ہر شے کی قدر اُس کے کم یا ب ہونے سے ہوتی ہے۔ اس کو وہ اس طرح لکھتا ہے ”اگر شبہا ہمہ شب قدر بودے شب قدر بے قدر بودے“ یا مثلاً اُس کو یوں بیان کرتا ہے کہ اپنے سے زیادہ علم والے سے مباحثہ کرنا نادانی ہے۔ اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ”ہر کہ بادا تا ترے از خود مجاہدہ نماید تا بداند کہ دانا ست بدانند کہ نادان ست“ یا مثلاً اس مطلب کو سب پیٹ کی خاطر ختی اُٹھاتے ہیں۔ وہ اس عنوان سے بیان کرتا ہے ”اگر جو رشتم نبودے پیچ مرغ درد ادا مینفتادے بلکہ صیاد خود دام نہ نہادے“ یا مثلاً یہ بات کہ حاکم رشوت سے دھیا ہو جاتا ہے اس طرح بیان کرتا ہے۔ ”ہمہ کس را دندان بہ ترشی کند گرد مگر قاضیان را بشیرینی“ یا مثلاً اس مطلب کو کہ ریا کے لیے لذتوں کو ترک کرنا بُرا ہے وہ اس اسلوب سے ادا کرتا ہے ”ہر کہ ترک شہوت از بہر قبول خلق دادہ است از شہوت حلال در شہوت حرام افتادہ است“ یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا ہے کہ کسی کی آہ و زاری سے قضاے الہی نہیں بدلتی اور قانون قدرت نہیں ٹوٹتا۔ اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے۔

قضا دگر نشود در ہزار تالہ و آہ بہ شکر یا بہ شکایت برآید از دہنے
فرشتہ کہ وکیل ست بر خزانہ باد چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے
یا اُس کو یہ کہنا ہے کہ اے ریاکاریہ دکھاوے کی عبادت تجھ کو خدا تک نہ پہنچائے گی۔
اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے۔

ترسم نری بہ کعبہ اے اعرابی کین رہ کہ تو میروی بہ ترکستانست
کبھی وہ ایک نصیحت کے مضمون کو جو اُسے بیان کرتا ہے ایک واقعے کی صورت میں بیان کر کے اُس کو زیادہ پُر تاثر اور دلنشین کر دیتا ہے مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگ ہزار ہا امیدیں اور اربابان دل میں لیے ہوئے مر گئے اسی طرح ایک روز ہم تم بھی مرجائیں گے اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

شنیدم کہ یکبار در وجلہ خن گفت با عابدے کلہ
کہ من فرماندہی داشتم بسر بہ کلاہ مہی داشتم
سپہم مدد کرد و نصرت وفاق گرفتہم بازوے دولتِ عراق

طمع کردہ بودم کہ کرمان خورم کہ ناگہ بخوردند کرمان سرم
 بکن پنہ غفلت از گوش ہوش کہ از مردگان پندت آید گوش
 اخیر کے شعر سے اُس نے یہ بات جتادی ہے کہ حقیقت میں کوئی کھوپڑی نہیں بولی تھی
 بلکہ یہ صرف بیان کرنے کا پیرایہ ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ دکھانا منظور تھا کہ ہر شخص اپنے مذہب کو
 حق اور دوسرے کے مذہب کو باطل سمجھتا ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔
 یکے جہود و مسلمان خلاف می جستند چنانکہ خندہ گرفت از نزاع ایشانم
 بہ طنز گفت مسلمان گر این قبلہ من درست نیست۔ خدایا جہود میرانم
 جہود گفت بہ توریت میخورم سوگند وگر خلاف کنم بہجو تو مسلمانم
 گر از بیط زمین عقل منعہم گردد بخود گمان نبرد ہیچ کس کہ نادانم
 یہ مطلب اگر ایک جلد میں بیان کیا جائے تو بھی اتنا مؤثر اور دلآویز نہیں ہو سکتا جیسا کہ
 اس پیرائے نے اُس کو دلآویز اور مؤثر کر دیا ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ امن اور
 عافیت اسی میں ہے کہ انسان لوگوں کے قصے جھگڑوں سے علیحدہ رہے اور خود داری کو ہاتھ سے
 نہ دے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

دو کس گردد دیدند و آشوب و جنگ پراگندہ نعلین و پرندہ سنگ
 یکے فتنہ دید از طرف بر شکست یکے در میان آمد و سر شکست
 کسے خوشتر از خویشتن دار نیست کہ باخوب و زشت کشش کار نیست
 یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا منظور تھا کہ جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا
 ہے وہ ایک بڑی جوابدہی اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے۔

آن شنیدی کہ صوفیہ می کوفت زیر نعلین خویش میخے چند
 آستینش گرفت سرہنگے کہ بیا نعل بر ستورم بند
 اس میں پیرایہ بیان کے علاوہ صوفی کی تخصیص کرنے سے شوخی اور ظرافت بھی انتہا
 درجے کی برتی ہے یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا تھا کہ بھیک مانگنا جو ایک مذموم خصلت ہے اس کا الزام
 صرف فقیروں ہی پر نہیں بلکہ دولت مندوں پر بھی ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔
 ”خواہندہ مغربی در صف بزازان حلب میگفت اے خداوندان نعت اگر شمار انصاف

بودے و مارا قناعت رسم سوال از جهان برخاستے“ یا مثلاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تواضع اور انکسار سے عزت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اُس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

یکے قطرہ باران زا برے چکید نخل شد چو پہناے دریا بدید
کہ جانیکہ دریا ست من کیستم گر او هست حتا کہ من نیستم
چو خود را بچشم حقارت بدید صدف در کنارش بجان پرورید
سپهرش بجائے رسانید کار کہ شد نامور لولوے شاہوار
بلندی بدان یافت کو پست شد در نیستی کوفت تا هست شد
یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح پارسا لوگ رندوں کی صحبت سے منقبض ہوتے ہیں اُسی طرح رند لوگ پارساؤں کی صحبت سے گھبراتے ہیں۔ اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے۔

زاہدے در میان رندان بود زان میان گفت شاہدے بلخی
گر ملولی زما ترش منشین کہ تو ہم در میان ما تلخی
کبھی وہ اپنے ہی کلام کو اور کا مقولہ قرار دے کر نہایت با مزا کر دیتا ہے جیسے۔

دو یتیم جگر کرد روزے کباب کہ سے گفت گویندہ با رباب
دریغا کہ بے ما بے روزگار بروید گل و بشگفتہ نو بہار
بے تیرودے ماہ اردی بہشت بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت
یا جیسے۔

چو دخلت نیست خرج آہستہ تر کن کہ میگویند ملا حان سرودے
اگر باران بکوہستان نبارد بسالے دجلہ گرد خشک رودے
یا جیسے۔

ہچنان در فکر آن یتیم کہ گفت پہلہانے بر لب دریائے نیل
زیر پایت گر بدانی حالِ مور ہچو حال تست زیرِ پائے پیل
یا جیسے۔

چہ خوش گفت با کودک آموزگار کہ کارے نکردیم و شد روزگار
یا جیسے

آن شنیدی کہ شادی بہ نہفت با دل از دست دادہ می گفت
تا ترا قدر خویشتم باشد پیش چہمست چہ قدر من باشد
(3) ان دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی
و معنوی اُن میں کثرت سے موجود ہیں۔ اور تقریباً نصف گلستان کے فقرے مسجع اور مقفی ہیں
بائیں ہمہ وہ سادگی میں ضرب المل ہیں اور جہاں نثر عاری کا ذکر آتا ہے وہاں سب سے پہلے
گلستان کی مثال دی جاتی ہے۔ فی الواقع یہ شیخ کی کمال انشا پردازی کی ایک بہت بڑی دلیل
ہے۔

شاعر اور فنی جب الفاظ کی زیادہ رعایت کرتا ہے تو اُس کے کلام میں خواہی نخواستہ
بناوٹ اور تکلف پیدا ہو جاتا ہے اور سررشتہ حسن معنی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ شیخ نے صنائع
لفظی و معنوی کو ایسی خوبصورتی اور سلیقے سے برتا ہے کہ کہیں ساختگی اور تصنع کا گمان نہیں ہوتا
مگر وہ ان عارضی نمائشوں کا ایسا پابند نہیں ہے کہ اُن کے لیے فصاحت و بلاغت سے دست
بردار ہو جائے جہاں الفاظ مساعدت کرتے ہیں وہاں ایک ہلکی سی چاشنی اس کی بھی دے دیتا
ہے۔ اُس کی نثر میں مسجع اور مرصع فقرے سادے فقروں میں ایسے ملے ہوئے ہیں۔ جیسے
پشمینے کی شال میں ریشم کے تار۔ جب تک خاص توجہ سے نہ دیکھا جائے تمام فقرے یکساں
اور ہموار معلوم ہوتے ہیں البتہ بعض حکایتوں میں اُس نے صنائع لفظی و معنوی کی زیادہ
رعایت کی ہے جیسے ساتویں باب کی اُنیسویں حکایت جس میں اپنا اور ایک شخص کا مناظرہ
تو نگری اور درویشی کے باب میں لکھا ہے مگر اُس میں بھی الفاظ کو حسن معنی میں خلل انداز
ہونے نہیں دیا۔ جس قدر اُس حکایت کے الفاظ میں تناسب اور حسن انتظام پایا جاتا ہے اُس
سے زیادہ خیالات میں سنجیدگی اور اصلیت اور واقعیت موجود ہے۔ حکایت مذکور کے چند
متفرق فقرے بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ ”تو گر ان دخل مسکینا نند۔ و ذخیرہ
گوشہ نشینان۔ و مقصد زائران و کھف مسافران۔ و متمحل بارگران۔ از بہر راحت و گران
دست بہ طعام انگہ برند کہ متعلقان وزیر و دستان بخورند۔ و فضلہ مکارم ایشان بہ ارامل و ایام

و پیران و اقارب و حیران برسند.....¹ از معدہ خالی چہ قوت آید۔ و از دست تہی چہ مروت زاید۔ و از پائے بستہ چہ سر آید۔ و از دست گرسنہ چہ خیر..... فراغت با فاقہ نمی پیوندند۔ و جمعیت با تنگدستی صورت نہ بندد۔ یکے تحریمہ عشا بستہ۔ و دیگرے منتظر عشا نشست۔ این بدان کیے ماند..... اشارت خواجہ عالم بقدر طاقت ایست کہ مرد میدان رضا اند۔ و تسلیم تیر قضا۔ نہ اینان کہ خرقة ابرار پوشند و قمہ ادرار نوشند..... مشغول کفاف از دولت عفاف محروم ست۔ و ملک فراغت زیر نگین رزق معلوم.....

..... گفت چندان مبالغہ در وصف ایشان بکردی۔ و سخباے بریشان بکفتی کہ وہم تصور کند تریاقت۔ یا کلید خانہ ارزاق۔ مشے متکبر و مغرور۔ و معجب و نفور۔ مشتغل مال و نعمت۔ و مفتن جاہ و ثروت۔ سخن گویند الا بسفاہت و نظر نکنند الا بکراہت۔ علما را بگدائی منسوب کنند۔ و فقر را بہ بے سرو پائی معیوب گردانند۔ بھوت مالے کہ دارند۔ و غیرت جائے کہ پندارند۔ بر تراز ہمہ نشیند۔ و خود را بہتر از ہمہ شناسند۔ نہ آن در سر دارند کہ سر یکے فرو در آزند۔ پیچہ از قولی حکما کہ گفتہ اند ”ہر کہ بطاعت از دیگران کم ست۔ و بہ نعمت بیش۔ بصورت تو گرسست و بمعنی درویش۔“ گفتم مذمت ایشان روا مدار کہ خداوند کرم اند۔ گفت غلط کردی کہ بندگان درم اند۔ چہ فائدہ کہ ابر آذرند۔ و بر کس نمی بارند۔ و چشمہ آفتابند و بر کس نمی تابند۔ و بر مرکب استطاعت سوارند۔ و نمیرانند۔ و قد سے بہر خدا نہ بہند۔ و در سے بے من و اذئی نہ بہند۔ مالے بمشقت فراہم آرند۔ و بہ خست گنہدارند و بہ حسرت بگذارند۔ چنانکہ بزرگان گفتہ اند ”سیم بخیل و قے از خاک بر آید کہ بخیل بہ خاک در آید..... گفتش بر بخل خداوندان نعمت و قوف نیافتہ الا بعلت گدائی۔ و گر نہ ہر کہ طمع کیسوند کریم و خیلش یکے نماید۔ محک دانند کہ زر چیست۔ و گدا دانند کہ مسک کیست۔“..... مجال عقل ست کہ اگر ریگ بیابان دُر شود۔ چشم گدایان بُد شود۔..... ہرگز دیدہ دست دعا نے بر کف بستہ۔ یا بعلت بینوائی در زندان نشستہ یا پردہ معصومے در یدہ۔ یا کلمے از معصم بر یدہ الا بعلت درویشی۔ شیر مردان را بحکم ضرورت در نقب ہا گرفتہ و کعب ہا سفتہ..... اغلب جہیدستان دامن عصمت بمعصیت آلایند و گرسنگان نان مردم ر بایند۔

1۔ (.....) یہ نشان اس بات کے ہیں کہ یہاں کچھ فقرے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

ہیت

چون سب درندہ گوشت یافت نہ پرسد کین شتر صالح ست یا خر دجال
..... گفتا نہ کہ من بر حال ایشان رحمت می برم۔ کفتم نہ۔ کہ بر مال ایشان حسرت
منخوری۔ ہر بید قے کہ براندے بدفع آن کوشیدے۔ و ہر شاہے کہ بخواندے۔
بفرزین پوشیدے تا نقد کیسہ ہمت در باخت۔ و تیر بچہ جت ہمہ بینداخت ہر جا کہ
گلست خارست و با خر خمار۔ و بر سر گنج مار۔ و آنجا کہ دُر شاہوارست۔ نہنگ مردم خوار۔ لذت
عیش دنیا را لدنہ اجل در پیش ست۔ و نعیم بہشت را دیوار مکارہ در پیش نظر نہ کنی در
بتان کہ بید مشک ست و چوب خشک۔ ہم چنین در زمرہ تو نگران شاگرد و کفور۔ و در حلقہ
درویشان صابرند و صبور۔ مقربان حضرت حق جل و علا تو نگرانند در ویش سیرت۔ و
درویشان تو نگر ہمت۔ مہین تو نگران آنست کہ غم درویشان بخورد۔ و بہمین درویشان آن کہ کم
تو نگران گیرد۔ نعم طاغہ ہستہ بدین صفت کہ بیان کردی۔ قاصر ہمت۔ و کافر نعمت۔ کہ
ببرند و بنہند و بخورند و نہ ہند۔ تو مے برین نمط ہستہ کہ شنیدی و طاغہ خوان نعت نہادہ و
صلاے کرم دردادہ و میان بخدمت بست۔ و ابرو بہ تواضع کشادہ طالب نامند و مغفرت۔ و
صاحب دنیا و آخرت۔

(4) شیخ اکثر ان کتابوں میں ایسی حکایتیں لکھتا ہے جن میں باوجود موعظت و تبلیغ کے
کسی قدر ظرافت و خوش طبعی کی بھی گنجائش ہو۔ پھر اپنے حسن بیان سے تمام حکایت کو نہایت
لطیف و طبع کر دیتا ہے۔ اور کبھی وہ ایک سیدھی سادی حکایت میں کوئی گرم فقرہ یا لطیف کنایہ
ایزا کر کے اُس میں نون مرچ لگا دیتا ہے تاکہ پسند و موعظت کی تلخی ظرافت کی چاشنی سے دور
ہو جائے۔ چنانچہ گلستان کے خاتمہ میں اُس نے لکھا ہے۔

غالب گفتار سعدی طرب انگیز ست و طہیت آمیز۔ و کوئے نظر ان را بدین علت زبان
طعنہ دراز کہ ”مغز دماغ بیہودہ بردن و دود چراغ بے فائدہ خوردن کار خردمندان نیست۔“
ولیکن برائے روشن صاحب دلائل کہ روی سخن در ایشانست پوشیدہ نہماند کہ دُر موعظتہاے صافی
در سلک عبارت کشیدہ ست و داروی تلخ نصیحت۔ بشہد ظرافت آمیزتہ۔ تا طبع طول انسان از
دولت قبول محروم نہماند۔“ جو ظرافت اُس نے بوستان اور گلستان میں برتی ہے وہ اکثر نہایت

سنجیدہ اور معقول ہے۔ البتہ کہیں کہیں اُس کے قلم سے ایسے الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں جو قانونِ شرم و حیا سے کسی قدر تجاوز ہیں۔ لیکن ایک ظریف طبع اور شوخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے بچنا اُسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد و عورت تقریباً تمام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اور جہاں مردوں کو عورتوں کی مجالست اور اُن کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ہمیشہ تحریر و تقریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے۔ ورنہ طبیعت کی شوخی ایک ایسی چیز ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح رُک نہیں سکتی۔

نکو رو تاب مستوری ندارد چو در بندی سراز روزن برآرد
اس قسم کی چند حکایتیں مثال کے طور پر یہاں لکھی جاتی ہیں۔

مثال: (1) مہمانِ پیرے بودم دردِ یارِ بکر کہ مالی فراوان داشت و فرزندے خوبرو۔ شے حکایت کرد کہ ”مرادر ہمہ عمر جز این فرزند نبوده است درختے درین وادی زیارت گاہ است کہ مردمان بحاجت خواستن آنجا روند۔ شبہاے دراز در پائے آن درخت بخت نالیدہ ام تا مرا این فرزند بخشد“ شنیدم کہ پسر بارفیکان ہی گفت ”چہ بودے اگر من آن درخت را بدانتے کہ کجاست تا دعا کردے کہ پدرم زودتر بمیرد“ خواجہ شادی کنان کہ پسر ماعقل ست و پسر طعنہ زن کہ پدرم فروت لا یعقل۔

قطعہ

سالاہا بر تو بگذرد کہ گذر نہ کنی سوے تربتِ پدرت
تو بجائے پدر چہ کردی خیر تا ہمان چشم داری از ہسرت

مثال: (2) پیر مردے را حکایت کنند کہ دخترے خواستہ و حجرہ بگل آراستہ و خلوت با او نشستہ و دیدہ و دل درو بست۔ شبہاے دراز نخفتے و بڈلہا و لطیفہا گفتے باشد کہ موانست پذیرد و وحشت نگیرد۔ بالجللہ شے مے گفت ”بخت بلندت یار بود و چشم دولت بیدار کہ بہ صحبت پیرے افتادی پختہ، پروردہ، جہان دیدہ، آرمیدہ، نیک و بد جہان آزمودہ، سرد و گرم روزگار چشیدہ، کہ حق صحبت بدانند و شرط مودت بجا آرد، مشفق و مہربان، خوش طبع و شیرین زبان۔

مثنوی

تا تو انم دلت بدست آرم در بیازاریم نیازارم
در چو طوطی شکر بود خورش جان شیرین فدای پرورش
نہ گرفتار آمدی بدست جوئے متعجب، خیرہ رائے، سرتیز، سبک پاپ، کہ ہر دم "ہو سے
پزد، و ہر شب جائے تشہد، و ہر روز یارے گیرد۔

قطعہ

جوانان خرم اند و خوب رخسار ولیکن در وفا با کس نپایند
وفا داری مدار، از بلبلان چشم کہ ہر دم بر گلے دیگر سرائند
بر خلاف پیران کہ بہ عقل و ادب زندگانی کنند۔ نہ بمقہائے جبل و جوانی۔

بیت

ز خود بہترے جوی و فرصت شمار کہ با چون خودی گم کنی روزگار
گفت چندان کہ برین نعت بگفتم گمان بردم کہ دلش در قید من آمد و صید من شد۔ ناگاہ
نفسے سر داز دل پُر درد بر آورد و گفت کہ چندین سخن کہ گفتی در ترازوی عقل من وزن آن یک
سخن ندارد کہ وقتے شنیدہ ام از قابلہ خویش کہ گفت "زن جوان را اگر تیرے در پہلو نشیند بہ کہ
پیرے" فی الجملہ امکان موافقت نبود بمفارقت انجامید۔ چون مدت عدتش بسر آمد عقد نکاحش
بستند با جوئے تند، ترش روئے، تہیدست بد خوئے، جور جفا میدید، ورنج و عنایم کشید و شکر نعمت
حق پہچان میگفت: کہ الحمد للہ از ان عذاب الیم برہیدم و بدین نعمت مقیم رسیدم۔

قطعہ

با تو مرا سوختن اندر عذاب بہ کہ شدن با دگرے در بہشت
بوئے پیاز از دمن خوروی خوب تر آید کہ گل از دست زشت

مثال (3)

مرا حاجیے شانہ عاج داد کہ رحمت بر اخلاق حجاج باد
شنیدم کہ بارے سگم خواندہ بود کہ از من بنوعے دلش ماندہ بود
بیندا ختم شانہ کین استخوان نمی بایدم دیگرم سگ مخوان

مہندار چون سرکہ خود خورم کہ جو رہ خداوندِ حلوا برم
 قناعت کن اے نفس بر اندکے کہ سلطان و درویش بنی کیے
 چرا پیش خسرو بجا جت روی چو یکسو نہادی طمع خسروی
 یہاں پہلی بیت کے دوسرے مصرعے ہیں رحمت کا لفظ کنایتاً بجائے نفیرین اور اُس
 کے مرادف الفاظ کے لایا گیا ہے۔ کیونکہ شعرا کے نزدیک حاجیوں کی سنگدلی، قساوت اور تکبر
 وغیرہ صفات ذمیرہ مسلم ہیں۔ چنانچہ گلستان میں بھی شیخ نے ایک جگہ لکھا۔
 ازمن بگوئے حاجی مردم گزای را کو پستین خلق بہ آزار میدرد
 حاجی تو نیستی شترست از براے آنکہ بیچارہ خار میخورد و باری برد
 ایک اور شاعر کہتا ہے۔
 چون عالمے کہ دل زدریخانہ جمع کرد حاجی ستم بخلق خدا بیشتر کند

پس ظاہر ہے کہ جو شوخی اس کنایہ میں ہے وہ صراحت میں ہرگز ممکن نہ تھی۔ اکثر
 ناواقف لوگ اس جگہ رحمت کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ مگر حکایت کا مضمون جس
 سے رنجش اور شکایت پائی جاتی ہے حقیقی معنی سے آیا کرتا ہے۔

مثال (4) باز رگانے را دیدم کہ صد و پنجاہ شتر بارداشت۔ و چہل بندہ خدمتگار۔ شے در جزیرہ
 کیش مرا بہ حجرہ خویش برد۔ و ہمہ شب نیارمید از سخباے پریشان گفتن کہ ”فلان
 انبارم بترکستان ست۔ و فلان بضاعت بہندستان۔ و این قبائل فلان زمین ست و
 فلان مال را فلان کس ضمین۔“ گاہ گفتے کہ خاطر اسکندر یہ دارم کہ ہوایش خوش ست۔
 و باز گفتے نہ کہ دریاے مغرب مشوش ست۔ سعد یا سفرے دیگر در پیش ست۔ اگر آن
 کردہ شود بقیت عمر بگوشتہ نشینم۔ گفتم آن کد ام سفرست۔ گفت ”گوگرد پاری بہ چین
 خواہم بردن کہ شنیدم کہ قیمت عظیم دارد۔ و از انجا کا سہ چینی بروم برم۔ و دیباے
 رومی بہ ہند۔ و پولاد ہندی بخلب۔ و آغبینہ حلبی بہ یمن۔ و بردیمانی پارس۔ ازان پس
 ترک سفر کنم و بدکانے نشینم۔“ چندا نے ازمین مالخو لیا فرو گفت کہ بیش طاقت گفتش
 نماند۔ گفت سعدی تو ہم سخنے بگواز آ نہا کہ دیدی و شنیدی۔ گفت تم:

نظم

آن شنیدستی که وقتی تاجرے
گفت چشم تنگ دنیا دار را

مثال (5):

ملک صالح از بادشاهان شام
بکشتے در اطراف بازار و کوی
که صاحب نظر بود و درویش دوست
دو درویش در مسجد خفته یافت
شب سردشان دیده نابردہ خواب
یکے زان دو میگفت با دیگرے
گر این بادشاهان گردن فراز
درآیند با عاجزان در بہشت
بہشت برین ملک و ماوای ماست
ہمہ عمر ازینان چہ دیدی خوشی
اگر صالح آنجا بدیوار باغ
چو مرد این سخن گفت و صالح شنید
دے رفت تا چشم آفتاب
روان ہر دو کس را فرستاد و خواند
بر ایشان ببارید باران جوہ
پس از رنج سرماؤ باران و سیل
گدایان بے جامہ شب کردہ روز
یکے گفت از اینان ملک را نہان
پندیدگان در بزرگی رسند

برون آمد صیدم با غلام
برسم عرب نیمہ بر بستہ روی
ہر آن کین دودار و ملک صالح اوست
پریشان دل و خاطر آشفته یافت
چو حربا تا تل کنان ز آفتاب
کہ در روز محشر بود داورے
کہ در لہو و عیش اند و با کام و ناز
من از گور سر بر نگیرم زخشت
کہ بند غم امروز بر پائے ماست
کہ در آخرت نیز زحمت کشی
در آید بکفکش بدرم دماغ
دگر بودن آنجا مصالح ندید
ز چشم خلاق فروشت خواب
بہ ہیبت نشست و بخرمت نشاند
فروشت شان گرد ذل از وجود
نشستند با نامداران خیل
معطر کنان جامہ بر عود سوز
کہ اے حلقہ در گوش حکمت جہان
زما بندگانت چہ آمد پسند

شہنشاہ ز شادی چو گل بر شکفت
 من آنکس نیم کن غرور حشم
 تو ہم با من از سر بنه خوی زشت
 من امروز کردم در صلح باز
 چنین راہ گر مقبلی پیش گیر
 براز شاخ طوبیٰ کسے بر نداشت
 ارادت نداری سعادت مجوی
 ترا کے بود چون چراغ التهاب
 وجودے دبدہ روشنائی کنججمع
 بخندید در روے درویش و گفت
 ز بے چارگان روے در ہم کشم
 کہ تا سازگاری کنی در بہشت
 تو فردا ممکن در برویم فراز
 شرف بایدت دست درویش گیر
 کہ امروز تخم ارادت نہ کاشت
 بچوگان خدمت توان برد گوئی
 کہ از خود پڑی بچو قندیل زاب
 کہ سوزیش در سینہ باشد چو شمع

(5) وہ اکثر نہایت پاکیزہ اور لطیف نکتے جن سے عموماً اذہان خالی ہوتے ہیں ایسی معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتا ہے جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں۔

مثال (1): ”ہر نفسے کہ فرد میر و دمہ حیات ست و چون بری آید مفرح ذات۔ پس در ہر نفسے دو نعمت موجود ست و بہر نعمتے شکرے واجب“۔ یہ بات کہ داخلی اور خارجی دونوں سانس کی انسان کی زندگی اور تفریح کے باعث ہیں سب کو معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر ایک نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ ہر سانس میں خدا کا شکر کرنا واجب ہے۔

مثال (2):

چو طفل اندرون دارد از حرص پاک
 چہ مشیت زرش پیش و چہ مشیت خاک
 یہ بات سب کو معلوم تھی کہ بچہ حرص اور طمع سے پاک ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اُس کو سونے اور مٹی میں کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ سونے اور مٹی کو برابر جاننا جو کہ اعلا درجے کے عرفاء اور خدا رسیدہ لوگوں کا منصب ہے۔ بچہ کو گویا فطرہ حرص اور طمع سے پاک ہونے کے سبب حاصل ہے۔ کیونکہ سونے اور مٹی میں کچھ فرق نہ کرنا جہی تک باقی رہتا ہے جب تک حرص اور طمع پیدا نہیں ہوتی۔ پس ایک شاعر، ز کہ فلسفی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔

مثال (3):

ازان کز تو ترسد بترس اے حکیم وگر با چو او صد بر آئی جنگ
ازان مار بر پائے راغی زند کہ ترسد سرش را بکوبد بسنگ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی عاجز اور زبردست بھی زیر دستوں پر غالب آجاتے ہیں اور سانپ کا وار بھی کبھی کبھی چرواہے پر چل جاتا ہے۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ جواپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنا چاہیے کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ جواپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

مثال (4):

دہ کہ گر مردہ باز گردیدے بمیانِ قبیلہ و پیوند
رژ میراث سخت تر بودے وارثان را ز مرگ خویشاوند

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ میراث بہت عزیز چیز ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ مرگِ خویشاوند سخت مصیبت ہے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ اگر مردہ پلٹ کر آتا تو وارثوں کو میراث کا واپس دینا اُس کے ماتم کے رنج سے زیادہ سخت اور ناگوار ہوتا۔

اس طرح وہ نہایت سرسری اور معمولی سرگزشتوں سے ایسے نادر اور اچھوتے نتیجے نکال لیتا ہے جو وہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہ میرے باپ نے بچپن میں مجھ کو ایک انگوٹھی پہنا دی تھی۔ ایک روز ایک شخص نے ایک کھجور دے کر مجھ سے وہ انگوٹھی لے لی۔ چونکہ بچہ انگوٹھی کی قدر نہیں جانتا اس لیے ذرا سی مٹھاس کا لالچ دے کر اُس سے لی جاسکتی ہے۔ پس جو لوگ عمر کو عیش شیریں میں برباد کر دیتے ہیں شاید وہ عمر کی قدر نہیں جانتے۔ یا مثلاً میں ایک بار عید کے دن باپ کے ساتھ عید گاہ میں گیا۔ اتفاقاً خلقت کے ہجوم میں باپ سے ہچکڑ گیا میں اُسی حالت میں رو رہا تھا کہ باپ نے آکر دفعۃً میرا کان مروڑا اور فرمایا ”میں نے تجھ کو بارہا کہا کہ میرا دامن پکڑے رہا کر مگر تو نہیں مانتا“ سچ ہے جس طرح انجان بچہ اپنے آپ رستہ نہیں چل سکتا اُسی طرح سالک بغیر مشائخ اور کاملین کی دھگری کے منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ یا مثلاً میرے جسم میں کپڑوں کے اندر ایک زخم تھا۔ شیخ علیہ الرحمۃ ہمیشہ پوچھتے تھے کہ کیسا ہے مگر یہ کبھی نہ کہتے تھے کہ کہاں ہے اس سے میں نے جانا کہ ہر عضو کا نام لینا روا نہیں

ہے یا مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کے کان اینٹھ کر کہا کہ ”نالایق! میں نے تجھ کو کلباڑی لکڑیاں چیرنے کو دی تھی، مسجد کی دیوار ڈھانے کو نہیں دی تھی“ اسی طرح زبان ذکر اور شکر کے لیے بنی ہے لوگوں کی غیبت کرنے کے لیے نہیں بنی۔ یا ”ایک شخص مٹی میں سنا ہوا مسجد میں جانے لگا دوسرے نے اُس کو جھڑک دیا کہ خبردار جو مسجد میں قدم رکھا۔“ میرا دل یہ بات سن کر بھر آیا کہ افسوس بہشت میں بھی جو ایک پاک جگہ ہے دامن آلودہ لوگ نہ جاسکیں گے۔

(6) حُسنِ تاویل اور لطفِ استدلال جیسا چاٹلا اُس کے کلام میں پایا جاتا ہے ایسا اور شعر کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

مثال (1):

شنیدم کہ در روزگارِ قدیم شدے سنگ در دستِ ابدالِ سیم
نہ پنداری این قولِ معقولِ نیست چو قانعِ شادی سیم و سنگتِ یکیست
یعنی یہ جو مشہور ہے کہ اگلے زمانہ میں ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے تھے۔
اس میں کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں اُن کے نزدیک پتھر اور چاندی میں فرق نہیں ہوتا۔ ایک امر خارقِ عادت کو کس حسنِ بیان کے ساتھ کیسے مختصر لفظوں میں عادت کے موافق ثابت کیا ہے۔

مثال (2):

رہ عقل جزِ پیچ در پیچ نیست	بہ عارفان جزِ خدا پیچ نیست
توان گفتن این با حقائق شناس	ولے خوردہ گیرند اہل قیاس
کہ پس آسمان و زمین چستند	بنی آدم و دام و دد کیستند
پسندیدہ پر سیدی اے ہوشمند	بگویم گر آید جوابت پسند
کہ ہامون و دریاؤ کوہ و فلک	پری آدمی زاد دیو و ملک
ہمہ ہرچہ مستند زان کمترند	کہ با ہستیش نام ہستی برند
عظیم ست پیش تو دریا بہ موج	بلندست گردون گردان بہ اوج
ولے اہل صورت کجا پے برند	کہ اربابِ معنی بملکے درند
کہ گرافاب بست یک ذرہ نیست	و گہفت دریاست یک قطرہ نیست

جو سلطان عزت علم برکشد جہان سر بجیب عدم درکشد
یہاں اُس نے وحدت وجود کے اصلی معنی جو کہ اہل نظر کی سمجھ سے بالاتر تھے نہیں
بتائے۔ بلکہ ایک اور معنی جن کو ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے نظم میں ایسی لطافت اور خوبی سے بیان
کیے ہیں کہ کوئی اور نثر میں بھی مشکل سے بیان کر سکتا۔
مثال (3):

گنہگار فرصت کی عالم دی ست دے پیش دانا بہ از عالمے ست
سکندر کہ بر عالمے حکم داشت دران دم کہ گزشت و عالم گداشت
میترا نبودش کزد عالمے ستانند و فرصت دہندش دے
یہاں اُس نے دو متضاد دعوے کیے ہیں۔ ایک یہ کہ عالم ایک سانس کا نام ہے۔
دوسرا یہ کہ ایک سانس عاقل کے نزدیک عالم سے بہتر ہے۔ پھر دونوں دعووں کو ایک دلیل
سے ثابت کیا ہے۔ کیونکہ جب ایک سانس کے نہ آنے سے تمام عالم سکندر کے ہاتھ سے جاتا
رہا تو معلوم ہوا کہ اسی سانس کا نام عالم تھا اور جب کہ ایک سانس اُس کو تمام عالم کے عوض
میں نہ مل سکا تو معلوم ہوا کہ ایک سانس تمام عالم سے بہتر تھا۔ یہ غایت درجے کا حسن
استدلال ہے کہ دو متضاد دعوے ایسی نگفتہ بیانی اور اختصار اور صفائی کے ساتھ ایک ہی دلیل
سے ثابت کیے جائیں اور حسن شعری بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

(7) نیچر کے بیان میں شیخ کا کلام فی الواقع لاثانی ہے۔ خدا کی صنعت اور حکمت کے
متعلق وہ وہی باتیں بیان کرتا ہے جو سب جانتے ہیں لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں کہ اُن کو ویسے
پاکیزہ اور دلنشین بیان کے ساتھ ادا کر سکے۔ اُس کے نیچرل بیان پر غالب مرحوم کا یہ شعر
صادق آتا ہے۔

شعر

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
مثال (1):

گر از حق نہ توفیق خیرے رسد کے از بندہ خیرے بہ غیرے رسد
زبان را چہ بینی کہ اقرار داد بہ بین تا زبان را کہ گفتار داد

در معرفت دیدہ آدمی ست	کہ بکشاوہ بر آسمان و زمی ست
کیت فہم بودے نشیب و فراز	گر این در نگر دے بروے تو باز
سر آورد و دست از عدم در وجود	درین جود بہاد در وے سجود
وگر نہ کے از دست جود آمدے	محالست کز سر جود آمدے
حکمت زبان داد و گوش آفرید	کہ باشد صندوق دل را کلید
اگر نہ زبان قصہ برداشتے	کس از سر دل کے خبر داشتے
وگر نیستے سعی جاسوس گوش	خبر کے رسیدے بسلطان ہوش
مرا لفظ شیرین خوانندہ داد	ترا سب دژاک دانندہ داد
مدام این دو چون حاجبان بر در اند	ز سلطان بہ سلطان خبر می برند
چہ اندیشی از خود کہ فعلم نکوست	از ان در نگہ کہ تقدیر او ست
برد بوستان بان بہ ایوان شاہ	بہ تحفہ ثمر ہم ز ایوان شاہ

اس نظم میں اُس نے یہ بات بیان کی ہے کہ بدون خدا کی توفیق کے آدمی سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور زبان، کان، آنکھ، سر اور ہاتھ جن ظاہری اغراض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ اغراض بیان کیے ہیں۔ یہ تمام باتیں کم و بیش ہر شخص کو معلوم ہوتی ہیں مگر جس ترتیب سے شیخ نے ان کو بیان کیا ہے اُس کے لحاظ سے تمام مضمون نرالا معلوم ہوتا ہے۔ اخیر بیت میں انسان کی بندگی اور عبادت کو باغبان کی ڈالی سے جو کہ بادشاہ ہی کے باغ میں سے بادشاہ کے لیے لگا کر لے جاتا ہے تمثیل دے کر مضمون کا حسن انتہا کو پہنچا دیا ہے۔

مثال (2):

دو صد مہرہ در یکدگر ساخت	کہ گل مہرہ چون تو پرداخت
رگت در صفت اے پسندیدہ خوی	زمینے در وسیعہ و شصت جوے
بصر در سر و فکر و رائے و تمیز	جوارح بدل دل بدانش عزیز
بہائم برد اندر افتادہ خوار	تو بہون الف بر قدمہا سوار
نگون کردہ ایشان سر از بہر خور	تو آری بہوت خورش پیش سر

نہ زبید ترا با چنین سروری کہ سر جز بطاعت فرود آوری
مثال (3):

شب از بہر آسائش تست و روز مہ روشن و مہر گیتی فروز
صبا از برائے تو فراش دار ہے گستراند بساط بہار
اگر باد و برفست و باران و منج وگر رعد چوگان زند برق تیغ
ہمہ کارواران فرمان برند کہ تخم تو در خاک مے پرورند
وگر تشنہ مانی ز سختی مجوش کہ سقائے ابر آبت آرد بدوش
ز خاک آورد رنگ و بوے و طعام تماشا گو دیدہ و مغز و کام
عسل دادت از نخل و من از ہوا رطب دادت از نخل و نخل از نوا
ہمہ نخلبدان بخایند دست ز حیرت کہ نخلے چنین کس نہ بست
خور و ماہ پروین برائے تو اند قنادیل سقف سرائے تو اند
ز خارت گل آورد و از نافہ مشک زر از کان و برگ تر از چوب خشک
بدست خود چشم و ابرو نگاشت کہ محرم بہ اغیار نتوان گذاشت
توانا کہ آن نازنین پرورد بالوان نعمت چنین پرورد
بجان گفت باید نفس بر نفس کہ شکرش نہ کار زبان ست و پس

(8) وہ اکثر قانون قدرت سے اشیاء کے حسن و قبح اور اصول اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے اور ایسا استدلال ہمیشہ دیگر اقسام استدلال کی نسبت زیادہ دلنشین اور عام فہم ہوتا ہے کلام الہی میں بھی مبادی و معاد کے ثبوت پر زیادہ تر اسی قسم کا استدلال کیا گیا ہے۔
مثال (1):

پلیدی کند گر بہ بر جاے پاک چو ز شمش نماید پوشد بہ خاک
تو آزادی از نا پسندیدہا متری کہ بروے قد دیدہا
نبی کو جو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ وہ جہاں کہیں بول و براز کرتی ہے اُس کو فوراً
مٹی سے ڈھا تک دیتی ہے۔ اس سے وہ اس بات پر استدلال کرتا ہے کہ بُرے اعمال کو ہمیشہ

لوگوں سے چھپانا چاہیے جو ایسا نہیں کرتے وہ ایکسچانور کی برابر بھی سمجھ نہیں رکھتے۔

مثال (2):

حلم شتر چنانکہ معلوم ست اگر طفلی مہارش گیر و صد فرسنگ بہر گردن از متابعتِ اود نہ
ہیچد۔ اما اگر را ہے ہولناک پیش آید کہ موجب ہلاک باشد و طفل آنجا بنادانی خواہد رفتن ز مام
از کفش در کسلاند۔ و بیش متابعت نکند کہ ہنگام در شتی ملاطفت مذموم ست۔

قطعہ

کسیک لطف کند با تو خاک پایش باش و گرسنیزہ کند در دو چشمش آفتن خاک
خن بلطف و کرم با درشت خوی گوی کہ زنگ خوردہ نگردد مگر بسوہن پاک
یہاں اُس کو یہ سو جھانا منظور تھا کہ نرمی وہیں تک پسندیدہ ہے جہاں تک دوسری طرف
سے درشتی اور سختی اور اپنی مضرت کا احتمال نہ ہو ورنہ مذموم ہے۔ اس مطلب پر وہ یہ دلیل لایا
ہے کہ اونٹ کو بھی قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہیں ہوتا ایک بچہ اُس
کی تکمیل پکڑ کر جہاں تک چاہتا ہے لے جاتا ہے مگر جہاں کچھ خوف ہوتا ہے وہاں اُس کی
اطاعت نہیں کرتا اور رستی توڑا کر بھاگ جاتا ہے۔

مثال (3):

برہ بر یکے پیشم آمد جوان	بہ تگ در پیش گوسفندے دوان
بدو گفتم این ریسمانست و بند	کہ مے آرد اندر پیت گوسفند
سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد	چپ و راست پونیدن آغاز کرد
برہ در پیش ہیچمان میدوید	کہ جو خوردہ بود از کعب مرد و خید
چو باز آمد از عیش و بازی بجایے	مرا دید و گفت اے خداوند راے
نہ این ریسمان میہد با منش	کہ احسان کند یست در گردش
بہ لطفے کہ دیدست پیل دمان	نیارد ہے حملہ بر پیلبان
بدان را نوازش کن اے نیک مرد	کہ مگ پاس دارد چو نان تو خرد
بران مرد کند ست دندان یوز	کہ مالد زبان بر پنیرش دو روز

یہاں اُس کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس قدر تم لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی

کر دے اُسی قدر لوگ تمہارے دوست اور خیر خواہ و جان نثار ہوں گے۔ اس پر وہ یہ دلیل لایا ہے کہ بکری، ہاتھی، کتا، چیتا اور اسی طرح تمام حیوانات کو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ جو شخص اُن کی پرورش کرتا ہے اور اُن کو کھلاتا پلاتا ہے وہ اُسی کا دم بھرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ وحشیوں میں وحشت اور درندوں میں سبّیت باقی نہیں رہتی۔

(9) وہ کبھی فقیہانہ اور واعظانہ نصیحتیں جو اکثر تلخ اور بے مزا اور سامعین کے دل پر گران ہوتی ہیں، انہیں بلکہ اکثر آزادانہ اور محققانہ نصیحتیں کرتا ہے جو اگرچہ عام خیالات سے کسی قدر بلند ہوتی ہیں۔ لیکن حدّ شرع سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتیں اور اس لیے اُن کو زہد اور رندوں پر پسند کرتے ہیں۔

مثال (1):

برہنگ سلطان چنین گفت زن	کہ خیز اے مبارک در رزق زن
برو تا زخوانت نصیبی دہند	کہ فرزندگانت بہ سختی درند
بگفتا بود مطبخ امروز سرد	کہ سلطان بشب نیت روزہ کرد
زن از ناامیدی سر انداخت پیش	ہے گفت با خود دل از فاقہ ریش
کہ سلطان ازین روزہ گوئی چہ خواست	کہ افطار او عید طفلان ماست
خورندہ کہ خیرش بر آید زدست	بہ از صائم الدہر دنیا پرست
مسلم کسے را بود روزہ داشت	کہ در ماندہ را دہد نان چاشت
وگر نہ چہ حاجت کہ زحمت بری	ز خود باز گیری و ہم خود خوری

مثال (2):

شنیدم کہ مردے براہ حجاز	بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز
چنان گرم رو در طریق خداے	کہ خار مغیلان نہ کندے ز پائے
باخر ز وسواس خاطر پریش	پسند آمدش در نظر کارِ خویش
بہ تلخیصِ اہلس در چاہ رفت	کہ نتوان ازین خوہر راہ رفت
گرش رحمت حق نہ دریافتے	غرورش سر از جادہ بر تافتے
یکے ہاتف از غیب آواز داد	کہ اے نیکیخت مبارک نہاد

مہندار گر طاعت کردہ کہ نزلے درین حضرت آوردہ
 بہ احسانے آسودہ کردن دلے بہ از الف رکعت بہر منزلے

(10) جب اُس کو کسی خاص فرقہ یا جماعت کے واقعی عیوب بیان کرنے ہوتے ہیں تو اُن کو ایسے عمدہ پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اُس کو یہ منظور تھا کہ امرا اور دولت مندوں کو اُن کے عیوب سے مطلع کرے تو اُس نے اِس مطلب کو صاف صاف نہیں لکھا بلکہ ایک فرضی مناظرہ اور ایک اور شخص کا جس میں اپنے تئیں امرا کا طرفدار اپنے حریف کو فقرا اور درویشوں کا حمایتی قرار دیا ہے لکھ کر تمام دل کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ طرف ثانی امیروں کی برائیاں اور درویشوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور شیخ اُس کی تقریر کو رد کر کے امرا کی خوبیاں اور درویشوں کی بُرائیاں ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اُس نے تمام سلاطین عہد اور وزرا اور امرا کی خاطر خواہ خبر لی ہے۔ چنانچہ گلستان کے ساتویں باب میں یہ مناظرہ موجود ہے یا مثلاً اُس کو مشائخ و زہاد کی قلعی کھوئی منظور تھی اِس مضمون کو اُس نے کھلم کھلا ادا نہیں کیا بلکہ ایک قصہ جو بوستان کے چوتھے باب میں مذکور ہے نقل کیا ہے جس کا ما حاصل یہ ہے کہ ایک شوخ چشم سائل کسی بزرگ کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا۔ صاحب خانہ کے پاس اُس وقت کچھ نہ تھا اس لیے کچھ نہ دیا۔ سائل نے ڈیوڑھی سے ذرا پرے ہٹ کر اُس کی اور اُس کے ساتھ تمام فقرا اور تمام مشائخ کی تفصیل اور توہین کرنی شروع کی اور خوب دل کے بخارات نکالے۔ جتنے واقعی عیب اکثر ان لوگوں میں ہوتے ہیں سب ظاہر کر دیے۔ جب شیخ صاحب اُن کے پترے کھول چکے تو سائل کے بیان کو اپنے اِس مقولے پر ختم کرتے ہیں۔

نخواہم درین باب ازین بیش گفت کہ شصت بود سیرت خویش گفت
 یعنی میں اِس باب میں اِس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا ورنہ وہی مثل ہوگی ”اپنا گھنٹا کھولے اور آپ ہی لاجوں مرے۔“ کیونکہ آپ بھی اُسی گروہ میں سے ہیں پھر اُس بزرگ کی تواضع اور قہل اور حلم کا بیان کیا ہے کہ باوجود ایسی زبان درازیوں کے اُس نے کچھ بُرا نہ مانا اور اُس کے گمان سے زیادہ اپنے عیبوں کا اقرار کیا۔

(11) یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ جو واقعات اسلاف سے نقل کیے جاتے ہیں وہ

اتنے موثر نہیں ہوتے جتنا کہ اپنی سرگذشت اور روداد کا بیان موثر ہوتا ہے بشرطیکہ بیان کرنے والا نہایت فصیح و بلیغ اور اپنے جذبات ادا کرنے پر قادر ہو کیونکہ جو روایت ایک واسطے سے سُنی جاتی ہے اُس کا یقین بہ نسبت اُس روایت کے زیادہ ہوتا ہے جو متعدد واسطوں سے سُنی جائے۔ دوسرے ناقل اپنی سرگذشت کو بہ نسبت اخبار ماضیہ کے زیادہ پُر جوش الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ گلستان اور بوستان میں چونکہ شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور اُن سے نتائج استخراج کیے ہیں اس لیے اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ شیخ جیسا جادو بیان اُن کو بیان کرتا ہے ایسی مثالوں سے دونوں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پراکتفا کیا جاتا ہے۔

مثال (1):

بہ صنعا درم طفلی اندر گذشت	چہ گویم کز انم چہ بر سر گذشت
تقفا نقشِ یوسف جمالے نکرد	کہ ماہی گورش چو یونس نخورد
درین باغ سروے نیام بلند	کہ باد اجل بنخش از بُن نکند
عجب نیست بر خاک اگر گل شگفت	کہ چندین گل اندام در خاک خفت
بدل کفتم اے ننگ مردان بمیر	کہ کودک رود پاک و آلودہ پیر
ز سودا و آشفگی بر قدش	بر انداختم سَنے از مردش
ز ہولم دران جائے تاریک و تنگ	بشورید حال و بگردید رنگ
چو باز آدم زان تغیر بہوش	ز فرزندِ دلہند آمد بگوش
گرت وحشت آمد ز تاریک جائے	بہش باش و با روشنائی درائے
ہپ گور خواہی منور چو روز	از بیجا چراغِ عمل بر فروز
تن کارکن می بلرزد ز تب	مبادا کہ نخلش نیارد ز طب
گروہے فراوان طمع ظن برند	کہ گندم نیفشاندہ خرمن برند
بر آن خورد سعدی کہ بچہ نشانہ	کسے بُرد خرمن کہ تحفہ نشانہ

(12) جب اُس کو کسی نیک کام کی ترغیب دینی ہوتی ہے تو ایسے غریب اور اجنبی

مباحث پیش نہیں کرتا جو لوگوں کے خیالات میں بہت کم گزرتے ہیں بلکہ ایسی معمولی باتیں یاد

دلاتا ہے جو اُس کام کی نسبت ہمیشہ خاص و عام کے دل میں گزرتی ہیں اور اُن کی آنکھوں کے سامنے پیش آتی رہتی ہیں۔ اور جب کسی امر پر اُس کو متنبہ کرنا منظور ہوتا ہے تو ایسے صاف اور صریح نتیجے سمجھاتا ہے جو دنیا میں ہمیشہ دیکھے جاتے ہیں۔ وہ کوئی نئی بات نہیں سکھاتا بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُس کے بیان کی طرف خود بخود لوگوں کے دل کھینچتے ہیں اور اُس کے کلام میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے کوئی مدت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے آتی ہے اور نہایت رغبت اور شوق سے کھائی جاتی ہے۔

مثال (1):

غبارش بیفشان و خارش بکن	پدر مردہ را سایہ بر سر قلن
مدہ بوسہ بر روئے فرزندِ خویش	چو بنی قتیے سراقلندہ پیش
وگر خشم گیرد کہ بارش برد	یتیم ار بگرید کہ نازش خرد
بلرزد ہے چون بگرید یتیم	آلا تا نگرید کہ عرش عظیم
بہ شفقت بیفشانش از چہرہ خاک	برحمت بکن آتش از دیدہ پاک
تو در سایہ خویشمن پرورش	اگر سایہ او برفت از سرش
کہ سر در کنار پدر داشتم	من انگہ سر تا جور داشتم
پریشان شدے خاطر چند کس	اگر بر وجودم نستستی گس
نابشد کس از دوستانم نصیر	کنون گر بزندان برندم اسیر
کہ در طفلی از سر بر فتم پدر	مرا باشد از دردِ طفلان خبر

مثال (2):

ز نامرمان گو فراتر نشین	پسر چون زده برگذشتش سنین
کہ تا چشم برہم زنی خانہ سوخت	بر پنبہ آتش نشاید فروخت
پسر را خردمندی آموز و رائے	چو خواہی کہ نامت بماند بجائے
بمیری و از تو نمائد کسے	کہ گر عقل و رایش نباشد کسے
پسر چون پدر نازکش پرورد	بسا روزگارا کہ سختی برد
گرش دوست داری بتنازش مدار	خردمند و پرہیزگارش برابر

بہ خردی درش زجر و تعلیم کن
 نو آموز را ذکر تحسین و زہ
 بیاموز پروردہ را دست رنج
 مکن تکیہ بر دستگاہے کہ ہست
 پایان رسد کیسہ سیم و زر
 چہ دانی کہ کزدیدن روزگار
 چو بر پیشہ باشدش دسترس
 ندانی کہ سعدی مکان از چہ یافت
 بہ خردی بخورد از بزرگان قفا
 ہر آن طفل کو جور آموزگار
 پسر را نکو دار و راحت رسان
 ہر آن کس کہ فرزند را غم نخورد
 نگہدار از آمیزگار بدش
 پسر کو میان قلندر نشست
 درغش مخور بر ہلاک و تلف
 بہ نیک و بدش وعدہ و بیم کن
 ز توبخ و تہدید استاد بہ
 دگر دست داری چو قارون بہ گنج
 کہ باشد کہ نعمت نماند بدست
 گمردد تہی کیسہ پیشہ ور
 بغربت بگرداندش در دیار
 کجا دست حاجت برد پیش کس
 نہ ہامون نوشت و نہ دریا شگافت
 خدا دادش اندر بزرگی صفا
 نہ بیند، جفا بیند از روزگار
 کہ چشمش نماند بدست کسان
 دگر کس غمش خورد و آوارہ کرد
 کہ بدبخت و بے رہ کند چون خودش
 پدر گو ز خیرش فرو شوئے دست
 کہ پیش از پدر مردہ بہ نا خلف

یہ خصوصیتیں جو گلستان اور بوستان میں ہم نے بتائی ہیں زیادہ غور کرنے سے اور بھی
 بہت سی باتیں ایسی نکل سکتی ہیں جو ان کتابوں کی مزید شہرت اور قبولیت کا باعث ہوئی ہیں مگر
 ہم انھیں پراقتصار کر کے اب شیخ کی غزلیات پر نظر ڈالتے ہیں۔

غزلیات شیخ

غزلیات کی ترتیب کا طریقہ جو فی زمانہ فارسی اور اردو دیوانوں میں مروج ہے اس طریقے پر غالباً سب سے اول شیخ ہی کا دیوان مدون کیا گیا ہے کیونکہ شیخ سے پہلے کے بعض دیوان غزلیات مثل خاقانی وغیرہ اب تک مجموعہ قصائد کی طرح غیر مرتب اور پراگندہ طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

علی بن احمد بے ستون جامع کلیات شیخ نے اول ہر غزل کے مطلع کا حرف لے کر شیخ کے تمام دیوان بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیے تھے۔ آخر اس ترتیب میں یہ قباحت نکلی کہ جس غزل کا مطلع معلوم نہ ہو اُس کا دیوان میں ملنا دشوار تھا۔ چنانچہ شیخ کی وفات کے بیالیس برس بعد اُس نے دوبارہ شیخ کے سب دیوان موجودہ طریقے پر مرتب کیے اور پھر یہ ترتیب عموماً جاری ہو گئی۔

شیخ کی غزلیات کے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا چار دیوان ہیں جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ طلیات ہے۔ باقی تین دیوان اس سے چھوٹے ہیں اگرچہ ان میں بعض دیوان ابتدائے عمر کے اور بعض سن کھولت اور پیری کے زمانے کے ہیں۔ مگر شیخ کا انداز بیان ابتدا ہی سے تغزل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں باعتبار صفائی اور سلاست کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں ہمیشہ صفائی اور گھلاوٹ ایک مدت کی مشق و مہارت کے بعد آتی ہے۔ غفوان شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا جیسا سن کھولت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے مگر شیخ کا کلام اس سے مستثنیٰ ہے۔ البتہ طلیات اور بدائع جو جوانی اور کھولت کے زمانے کے دیوان ہیں ان میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی نزاکت اور زور بیان زیادہ پایا جاتا ہے۔

شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نمکدان شعر لکھا ہے اگرچہ اس سے پہلے

انوری و خاقانی و ظہیر وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں اور قدما کے قصائد میں بھی مثل متاخرین کے اکثر تشبیہوں میں تغزل یعنی عاشقانہ اشعار ہوتے تھے۔ مگر اُس وقت غزل میں یہ لذت نہ تھی جو شیخ نے اپنی جادو بیانی سے پیدا کی۔ پہلے شاعری کا مدار زیادہ تر قصیدے اور مثنوی پر تھا۔ بعضے دوہتی (یعنی رباعی) اور قطعے کے سوا اور کچھ نہ کہتے تھے۔

شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور بامزہ کر دیا کہ لوگ قصیدے اور مثنوی کو چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے۔ غزل گو یوں کے نام یا تو انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے یا لاکھوں سے متجاوز ہو گئے اسی واسطے بعض شعرا نے شیخ کو غزل کا پیسیر کہا ہے۔ مگر کلام کی نمکینی اور شیرینی محض وجدانی کیفیتیں ہیں جو بدون ذوق سلیم کے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتیں۔ پس صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کا دیوان نمکدان شعر ہے یا وہ غزل کا پیسیر ہے انھیں کے لیے کافی ہے جو شعر کا پورا پورا انداز رکھتے ہیں اُن کے سوا اور لوگ جب تک کوئی صریح مابہ الامتیاز شیخ اور قدما کی غزل میں بیان نہ کیا جائے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی غزل کو کیا فوقیت ہے۔ لیکن وجدانیات میں فرق بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

میں نے شیخ اور انوری و خاقانی و ظہیر کی غزلیات کو صرف اس غرض سے دیکھا کہ وہ تفاوت جو شیخ اور قدما کی غزلیات میں ہے صاف صاف معلوم ہو۔ مجھ کو چند باتیں شیخ کے دیوان میں ایسی ملی ہیں جو قدما کے کلام میں یا تو بالکل نہیں یا بہت کم پائی جاتی ہیں میرے نزدیک یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنہوں نے غزل کو نہایت بامزا اور لطف انگیز اور مرغوب طبائع خاص و عام کر دیا ہے۔

(1) شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزل اور تغنی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ جو کہ اکثر اُس کو نثر سے زیادہ دلفریب اور دلکش کر دیتا ہے وزن اور قافیہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی دلفریبی زیادہ ہو جائے گی۔ اسی لیے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی بن احمد جامع کلیات شیخ جس نے شیخ سے 42 برس بعد اس کا کلام جمع کیا۔ اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلس سماع منعقد تھی جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی۔

نظر خدای پیمان ز سر ہوا نباشد سفر نیازمندان ز رہ خطا نباشد
مجلس کے خاص و عام جا بجا بے ہوش اور از خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے
برخواست ہونے کے بعد سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مدت عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا۔
میں کہتا ہوں کہ ایک بار میں نے بھی ایک بزرگ کو جو سماع سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے شیخ کے
ایک مطلع پر جو قوال نے بے مزامیر کے اُن کے سامنے گایا تھا دیکھا کہ اُن کا تمام بدن کانپنے لگا
تھا اور آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے اور یہ کیفیت اُن پر بہت دیر تک طاری رہی تھی وہ مطلع
یہ تھا۔

اے کہ آگاہ نہ عالم درویشان را تو چہ دانی کہ چسودا سرست ایشان را
(2) شیخ کی غزل کو اُس جہلی عشق و محبت نے جو اُس کی بات بات سے نیچتی ہے اور بھی
زیادہ چمکا دیا تھا۔ عرب اور عجم کے تمام شعرا جو عاشق مزاج ہوئے ہیں ان کی تشبیب اور تغزل
میں ایک خاص حالت پائی جاتی ہے۔ جو اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ شیخ ایک
جگہ خود فرماتے ہیں ”آئندہ نشید ست ہرگز بوئے عشق۔ گو بشیر از آو خاک مابوی“۔ یہی
سبب ہے کہ وہ حسن و عشق، وصل و جدائی، یاس و امید، صبر و مجبوری، وعدہ و انتظار اور دیگر
لوازم عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے اُن میں بالکل تصنع نہیں پایا جاتا اور وہ سب ایسی باتیں
ہوتی ہیں جو اُس عالم میں ہر شخص پر گزرتی ہیں۔ اسی واسطے عشاق کے دل پر اُن کا زیادہ اثر
ہوتا ہے ایسے اشعار سے شیخ کے چاروں دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مگر چند شعر بطور نمونے کے
یہاں لکھے جاتے ہیں۔

مقدار یار ہم نفس چون من نداند ہچکس	ماہی کہ در خشک اوقند قیمت بداند آب را
ایکہ گفتی ہچ مشکل چون فراق یار نیست	گر امید وصل باشد آں چنان دشوار نیست
ہر کو ہمہ عمرش سوداے گلے بودہ ست	داند کہ چرا بلبل دیوانہ ہے باشد
دل و جانم تو مشغول و نگہ بر چپ و راست	تا ندانند رقیبان کہ تو منظور منی
دیگران چون بردند از نظر از دل بردند	تو چنان در دل من رفتہ کہ جان در بدنے
گفتہ بودم کہ رخت بر بندم	تا رہ بصرہ گیرم و بغداد
دست از دامنم نمے دارد	خاک شیراز و آب ز کناباد

ہزار جہد بکرم کہ سر عشق پوشم نبود بر سر آتش میترم کہ بخوشم
 بہ زخم خورد حکایت کنم ز دست جراحت کہ تندرست ملامت کند چو من بخوشم
 نغمات صبح دانی ز چہ روی دوست دارم کہ بروی دوست ماند کہ براقلند نقابے
 بردائے گدای مسکین و درے دگر طلب کن کہ ترا بار بار گفتی و نیامدت جوابے
 شربتے تلخ تر از درد فراقبت باید تا کند لذت وصل تو فراموش مرا
 بر عندیپ عاشق گر بگلنی قفس را از ذوق اندرونش پروائے در نباشد
 برقی میانی بحست باد بہاری بخاست طاقت مجنون نماوند خیمہ لیلی کجاست

(3) اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جن سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقع ہے اور وہاں جو حالت اُس نے آنکھوں سے دیکھی ہے یا جو کیفیت اُس کے دل پر گزری ہے اُس کو بیان کر رہا ہے۔ اس قسم کے اشعار اکثر ایسے موقعوں پر جہاں اُسی طرح کی کیفیت پیش آتی ہے نہایت مزادیتے ہیں مثلاً۔

ای رو بہک چرا نہ نشستی بجای خویش با شیر پنچہ کردی و دیدی سزائے خویش
 ساربان آہستہ دان کارام جان در محل است اشتراں را بار بار پرشت ست و مارا بردل ست
 چہ رویت اینکہ پیش کاروان ست مگر شمعے بدست ساربان ست
 سلیمان ست گوئی در عماری کہ برباد صبا تختش روان ست
 ز روی کار من برقع بر انداخت بیکبار آنکہ در برقع نہان ست
 شتر پیشی گرفت از من برقرار کہ بر من بیش ازان بارگران ست
 بدار اے ساربان محمل زمانہ کہ عہد وصل را آخر زمان ست
 یار بار افتادہ را در کاروان بگذاشتمد بیوفا یاران کہ بر بستمد بار خویش را
 ہر کردار خاک غربت پائے در گل ماند ماند گو دگر در خواب خوش بیند دیار خویش را
 پیوند روح میکند این باد مشک بیز ہنگام نوبت سحر ست ای ندیم خیز
 شاہد بخوان و شمع بسوزان و گل بنہ عنبر بسای و عود بسوزان و گل بریز
 خادمہ سرائے را گو در حجرہ بند کن تا بہ سر حضور مارہ نبرد موسوسے

(4) وہ اکثر حالات و واردات کو جو اُس کے دل پر گزرتے ہیں تمثیلات میں بیان کر کے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کرتا ہے۔ اس قسم کی تمثیلات حکیم سنائی اور مولانا روم کے کلام میں بھی بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً۔

بلخ شازگان افتادہ بودم	ندانستم کہ در سنج اند ماران
اے برادر ما بگرداب اندریم	وانکہ شصت میزند بر ساحل ست
رطب شیرین و دست از نخل کوتاہ	زالال اندر میان و تشنہ محروم
اُستادِ کیمیا را بسیار زر ببايد	در خاک تیرہ کردن تا آنکہ زر پاشد

(5) شیخ کی غزل میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر ایک نزاکت اور چوچلا پایا جاتا ہے جس سے قدما کی غزل معرا معلوم ہوتی ہے وہ ایک سیدی سی بات کو ہیر پھیر کر ایسے لطیف اور خوشنما پیرایے میں ادا کر دیتا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ نگر یزوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گران بہا بنا دیتا ہے۔ مثلاً۔

بود ہمیشہ پیش ازین رسم تو بیکنہ کشی	از چہ مرا نمی کشی من چہ گناہ کردہ ام
خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من	وین عجب کان وقت میگیرم کہ کس بیدار نیست
من ندانستم از اوّل کہ تو بے مہر و وفائی	عہد تا بستن از ان بہ کہ بہ بندی و نپائی
دوستان عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم	باید اوّل بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی
گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم	چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی
من آن نیم کہ حلال از حرام نشناسم	شراب با تو حلال ست و آب بتو حرام

اس خاصیت میں شیخ کی غزل سے جو نسبت قدما کی غزل کو ہے اُس کا اندازہ شیخ کے چند اشعار کا مقابلہ قدما کے اشعار کے ساتھ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر دو شعر خاقانی اور انوری کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار شیخ کے دیوان سے نقل کیے جاتے ہیں۔

انوری	سہری
روی چون ماہ آسمان داری	سرورامانی ولیکن سرورارفتار نیست
قدّ چون سرو بوستان داری	ماہ رامانی ولیکن ماہ را گفتار نیست

<p>ایضاً</p> <p>قادری بر ہرچہ میخوای بجز آزار من زانکہ گرمشیر بر فرقم زنی آزار نیست</p>	<p>ایضاً</p> <p>ہمہ با من جفا کند لیکن بجفا بچ از د نیاز ام</p>
<p>ایضاً</p> <p>ہمہ چشم تا برون آئی ہمہ گویش تا چہ فرمائی</p>	<p>خاقانی</p> <p>بہ رخت چہ چشم دارم کہ نظر دریغ داری بہ رہت چہ گوش دارم کہ خبر دریغ داری</p>
<p>ایضاً</p> <p>ہردم از شاخ زبانم میوہ تر میرسد بوستانہا رستہ زان تخمیکہ در دل کاشتی</p>	<p>ایضاً</p> <p>شاد باش از حسن خود کہ ز وصف تو سحر حلال طبع خاقانی بہ نظم آورد و دیوان تازہ کرد</p>

(6) سب سے بڑی بات جو شیخ اور قدما کی غزل میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اُس کے دیوان کو نمکدان شعرا کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مادہ زیادہ تر مضامین مندرجہ ذیل پر ہے تصوف اور درویشی، عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیرایے میں ادا کرنا اور شاہد مطلق کے شیون اور صفات کو زلف و خال و خط و لب و دندان وغیرہ سے تعبیر کرنا۔ کالمین اور عرفا اور مشائخ پر رند، بادہ خوار میسر و ش، پیر خرابات وغیرہ کے الفاظ اطلاق کرنے اور اُن کے حالات اور واردات کو شراب و نغمہ و دف و چنگ وغیرہ کے لباس میں ظاہر کرنا۔ سلوک اور فقیری کے مدارج مقامات یعنی صبر و رضا و تسلیم و توکل و قناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا۔ محاسب و زاهد و فقیہ اور ایسے لوگوں پر جو مذہب کی رو سے محفل ادب ہیں طعن و تعریض کرنی اور غیر متشرع اور آزاد لوگ جواز روئے مذہب کا قائل تو ہیں و مذمت ہیں اُن کی خوبی ظاہر کرنی۔ دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتانے۔ نامحوں کی نصیحت سے نفرت اور رسوائی و بدنامی کی رغبت ظاہر کرنی۔ عقل و دانش کی جا بجا توہین اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر اُس کی تعریف کرنی۔ ساقی و مطرب کو بار بار پکارنا اور اُن سے شراب و نغمے کا اس لیے طلبگار ہونا کہ دنیا کے تعلقات سے انقطاع میسر آئے۔ باد صبا اور نسیم سحری اور بوئے گل کو اکثر مخاطب کرنا اور اُن کو قاصد و پیغامبر ٹھہرا کر اپنی آرزوئیں اور مرادیں اور حسرتیں اُن سے بیان کرنی وغیرہ وغیرہ یہ تمام عنوان ہر شخص کو مرغوب ہوتے ہیں

مثلاً عشق حقیقی کی واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرایے میں بیان کرنی اور زلف و خال و خط سے شاہد مطلق کے شیون اور صفات مراد یعنی زیادہ دلکش اور موثر ہیں بہ نسبت اس کے کہ کھلی سورٹھ گائی جائے۔ یعنی عشق حقیقی کو صاف صاف اس طرح بیان کیا جائے جیسے اکثر ادنیٰ درجے کے شاعر یا موزوں طبع مولوی اور واعظ نظم میں توحید و مناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں۔ حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیث دیگران

اسی طرح واعظ، زاہد، شیخ، قاضی، صوفی، محتسب اور ایسے اشخاص کو جن کی مذہب میں تعظیم کی جاتی ہے۔ ریا کاری اور کمر اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے لتاڑتا اور رند و باش اور حُسن پرست و بادہ خوار لوگوں کو اُن کی صاف باطنی۔ آزادی اور بے ریاکی کی وجہ سے تعریف کرنی بہ نسبت اس کے کہ رندوں کو ملامت کی جائے اور متشرع لوگوں کی تعریف کی جائے زیادہ مزے دار ہے اور زیادہ توجہ سے سنا جاتا ہے۔

اگرچہ ان میں سے بعض عنوان جستہ جستہ قدماء کی غزل میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن شیخ کے ہاں اول تو کثرت سے ہیں اور دوسرے اُس کے حسن بیان نے اُن کو بہت زیادہ اور لطف انگیز کر دیا ہے۔ شیخ کے بعد اول حضرت امیر خسرو اور میر حسن دہلوی نے اس خصوصیت میں شیخ کا تتبع کیا ہے کیونکہ شیخ نے اپنے چاروں دیوان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ملتان میں خان شہید کے پاس جس کے ہاں امیر خسرو نوکر تھے اپنی زندگی ہی میں بھیج دیے تھے۔ اس وقت حضرت امیر کی عمر میں برس سے بھی کچھ کم تھی اور شاعری میں ترقی کرنے کے لیے اُن کے آگے ایک وسیع میدان موجود تھا۔ وہ اگرچہ اور اصنافِ سخن میں جیسا کہ مثنوی نہ سپہر¹ میں

1۔ نہ سپہر کے اشعار یہ ہیں۔

کس نہ بیند سو نظم دلیگر	کہ مگرد بدلے منزل گیر
چون نماند بہ دل غلیغی یاد	گرچہ شد زادہ همان دان کہ نژاد
تا بجائے کہ حد پارسیان	اندین عہد دو تن گشت عیان
زان یکے سحر و جانیس تمام	ہر دو را در غزل آئین تمام
لیک اگر سوے دگر بازے ہست	شعر شان ہست بدان گو نہ کہ ہست

لکھتے ہیں اپنے تئیں شیخ سے بہتر سمجھتے تھے مگر شیخ کی غزل کو وہ بھی مانتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بر بخت شیرہ از خم خانه مستی کہ در شیراز بود
نیز جس طرح شیخ نے بچپن کے زمانہ کی غزلوں کا نام غزلیات قدیم اور جوانی اور
کہولت کی غزلیات کا نام طلیات اور بدائع اور آخر عمر کی غزلیات کا نام خواتیم رکھا ہے اسی
طرح حضرت امیر نے بھی عمر کے چار زمانوں کے موافق چار دیوان مرتب کیے ہیں۔
تحفۃ الصغر - وسط الحیاة - غرة الکمال - بقیہ نقیہ ان قرینوں کے سوا حضرت امیر کی غزلیات
سے بھی صاف پایا جاتا ہے کہ وہ سعدی کے تتبع سے خالی نہ تھے۔ امیر خسرو کے بعد خواجہ حافظ
شیراز نے بھی غزل کی بنیاد زیادہ تر انھیں خیالات پر رکھی ہے جن کو سب سے اول شیخ نے
چکایا تھا مگر ان میں بعض مضامین کو خواجہ حافظ نے ایسی رونق دی ہے کہ وہ انھیں کا حصہ ہو گئے
ہیں۔ جیسے تصوف، شراب، اہل ظاہر پر خردہ گیری، دنیا کی بے ثباتی، عقل و تدبیر کی توہین،
عشق و جوانی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ۔

اب ہم کچھ غزلیں اور اشعار شیخ کے دیوان میں سے ایسے نقل کرتے ہیں جن میں
مضامین مذکورہ بالا زیادہ تر باندھے گئے ہیں۔

بر باد قلاشی دبیم این شرک تقویٰ نام را	بر خیز تا کیسو نہیم این لہق ارزق فام را
تا کو دکان در پے ہمت این پیر درد آشام را	مے با جوانان خوردنم خاطر تمنا میکند
کز بوستان باد سحر خوش میدہد پیغام را	زین تنکنای خلوتم خاطر بہ صحرا مے کشد
باشد کہ نتواں یافتن دیگر چنین ایام را	غافل مباحث ارباعالی در یاب گر صاحب دلی
مانیز در رقص آوریم آن سر دسیم اندام را	جانیکہ سرو بوستان با پائے چوبین میرود

☆☆☆

ساقی بیار آن جام مے مطرب بسازن ساز را	وقت طرب خوش یا قہیم آن دلبر طناز را
آہستہ تا نبو خبر ندان شہد باز را	امشب کہ بزم عارفان از شیخ رویت روخت
بگر کہ لذت چون یو محبوب خوش آواز را	روی خوش و آواز خوش داند ہر یک لذت

☆☆☆

جان ندارد ہر کہ جانائش نیست تنگ عیش ست آنکہ بتائش نیست
گر دلے داری بدلدارے سپار ضالع آن کشور کہ سلائیش نیست
ماجرای عقل پرسیدم ز عشق گفت معزول ست و فرمانش نیست
درد عشق از تندرستی خوشتر ست گرچہ غیر از صبر درمانش نیست

☆☆☆

چنان بموی تو آشفته ام بوی مست کہ نیم خبر از ہرچہ در دو عالم هست
دگر بروی کسم دیدہ بر نئے باشد ظلیل من ہمہ بت ہائے آذری بشکست
غلام ہمت آنم کہ پائے بندیکیت بجائے متعلق شد از ہزار برست
نگاہ من بتو و دیگران بتو مشغول معاشران ز مے و عارفان ز ساقی مست
برادران و عزیزان ہمتیم تکلید کہ اختیار من از دست رفت و تیرا زشت

☆☆☆

خوشتر از دوران عشق ایام نیست بامداد عاشقان را شام نیست
مطربان رقص و صوفی در سماع عشق را آغاز ہست انجام نیست
از ہزاران در یکے گیرد سماع زانکہ ہر کس محرم پیغام نیست
ہر کسے را نام معشوقی کہ ہست می برد معشوقی مارا نام نیست
باد صبح و خاکب شیراز آتشے ست ہر کہ او دروے گرفت آرام نیست
سعدیا چون بت نکستی خود مباحش خود پرستی کمتر از اصنام نیست

☆☆☆

دلے کہ عاشق و صابر بود مرسکست ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسکست
برادران طریقت ہمتیم مکید کہ توبہ در رو عشق آہمینہ و سکست
دگر بہ خفیہ نمی بایدیم شراب و سماع کہ نیک نامی در دین عاشقان نکست
چہ تربیت شنوم یا چہ مصنعت ینم مرا کہ چشم بساقی و گوش بر چکست
ہمتیم رفتہ مارا کہ مہر و پیغام بیا کہ ما سپہ انداختیم گر جنگست
بیادگار کسے دامن نسیم صباح گرفتہ ایم و چہ حاصل کہ باور و چکست

بکش چنانکہ تو دانی کہ بے مشاہدہ است فراختای جهان بر وجود ما تنگست
ملا مت از دل سعدی فرو نشوید عشق سیاهی از جشی چون رود کہ خود رنگست

☆☆☆

دوش بے روی تو آتش بسرم بر میشد آیم از دیدہ ہمیرفت و زمین تر میشد
تا بہ افسوس بی پایان زرد عمر عزیز ہمہ شب ذکر تو میرفت و مکرر میشد
چشم مجنون چو بختی ہمہ لیلی دیدے مدعی بود گردش خواب میسر میشد
یارب آن صبح کجافرت کہ شبہائے دگر نفسے میزد و آفاق منور میشد
سعدیا عقد ثریا مگر امشب بکسخت ورنہ ہر شب ز گریبان سحر بر میشد

☆☆☆

مقلب درون جملہ ناز چہ خبر دارد از شبان دراز
جہد کردم کہ دل بکس ندہم چہ توان کرد با دو دیدہ باز
مختب در قفای زندان ست غافل از صوفیان شاہد باز

☆☆☆

از تو با مصلحت خویش نمی پردازم بچو پروانہ کہ مے سوزم و در پردازم
گر تو خواهی کہ بجوئی دلم امروز بجوی ورنہ بسیار بجوئی و نیابی بازم
من خراباتی و دیوانہ ام و عاشق و بس بیشتر زین چہ حکایت بکند غلامم
ماجرائے دل دیوانہ بلفتم بہ طیب کہ ہمہ شب در چشم ست بفکرت بازم
گفت زین نوع حکایت کہ تو داری سعدی در عشق ست و ندانم کہ چہ درمان سازم

☆☆☆

برخیز تا طریق تکلف رہا کنیم دکان معرفت بدو جو بہ بہا کنیم
گر دیگر آن نگار قبا پوش بگورد ما نیز جاہلے تصوف قبا کنیم

☆☆☆

ساقیائے دہ کہ مادر دی کش میخانہ ایم با خرابات آشناؤ از خرد بیگانہ ایم
خویشمن سوزیم و جان بر سر نہادہ شمع دار ہر کجا در محلے شمعے ست ما پروانہ ایم

اہل دانش را درین گفتار با ما کار نیست عاقلان را کے زیان دارد کہ مادیوانہ ایم
خلق میگویند جاہ و فضل در فرزانگیست گو مباش لبہا کہ مارندان تا فرزانہ ایم
عیب تست از چشم گوہر بین نداری ورنہ ہر یک اندر بحر معنی گوہر یکدانہ ایم

☆☆☆

دو چشم مست میگویش بہر آرام ہشیاران دو خواب آلودہ بر بوند عقل از دست بیداران
نصیحت گوی را از من گویاے خوبہ دم در کش کہ سیل از سر گذشت آزا کہ میترسانی از باران
چہ بویست آنکہ عقل از من بہر دہر و ہشیاری ندانم باغ فردوس ست و یا باز از عطاران
تو با این مردم کوتہ نظر در چاہ کنعانی بمصر ما پدید آیند یوسف را خریداران
اے کہ ز دیدہ غائبی در دل مانشتہ حسن تو جلوہ میکند وین ہمہ پردہ بستہ
خاطر عام بردہ خون خواص خوردہ ما ہمہ صید کردہ خود ز کمند بستہ

☆☆☆

می برزند ز مشرق شمع فلک زبانہ اے ساتی صبحی در دہ مے شبانہ
عقلم بدزد لختے چند اختیار دانش ہوشم بہر زمانے تا کے غم زمانہ
صوفی چگونہ گردد گرد شراب صافی کنجک را نہ گنجہ عنقا در آشیانہ
آن کوزہ بر کفم نہ کاب حیات دارد ہم طعم نار دارد ہم رنگ نار دانہ
گرمی بجان دہنت بستان کہ پیش دانا ز آب حیات خوشتر خاک شرابخانہ
ہر روز بادی برد از بوستان گلے مجروح میکند دل مسکین بلبلے
رویت ماہ پیکر و مویست مشک بوی ہر لالہ کہ میدہ از خاک و سبلے
بالای خاک ہیچ عمارت نکردہ اند کزوے بدیر و زود نباشد تحولے
کمرہ طلعتے ست جہان فریب ناک بر بامداد کردہ بہ شونی تحیلے
دے بوستان از حرم صحراء لالہ زار وز بانگ مرغ در چمن افتادہ غلغلے
و امروز خارہائے مغلطان کشیدہ تیغ کوئی کہ خود نبود درین بوستان گلے
دنیا پلے ست رہگذر دار آخرت اہل تمیز خانہ گیرند بر پلے

☆☆☆

ایکے آگاہ تہ عالم درویشان را
 تنج آزادی و گنج قناعت مکی ست
 طلب منصب فانی نکند صاحب عقل
 جمع کردند و نهادند و محسرت رفتند
 در ازل بود کہ پیمان محبت بستند
 عاشقہ سوختہ بے سرو سامان دیدم
 نفسے سرد بر آورد و ضعیف از سرزد
 چند دلہند تو در گوش من آید ہیہات
 سعدیا عمر عزیزست بغفلت مگذار
 تو چہ دانی کہ چہ سودا بہ سرست ایشانرا
 کہ ہمشیر میسر نشود سلطان را
 عاقل آنست کہ اندیشہ کند پایان را
 وین چہ دارد کہ محسرت نگذارد آن را
 نکلند مرد اگرش سر برود پیمان را
 گفتیم اے یار مکن در سر فکرت جان را
 گفت بگذار من بے سرو بے سامان را
 مکنہ بر درد حرصم چہ کنم درمان را
 وقت فرصت نشود فوت مگر نادان را

☆☆☆

لا ابالی چہ کند دفتر دانائی را
 دیدہ را فائدہ آنست کہ دلبر بیند
 ہمہ دانند کہ من سبزہ خط دارم دوست
 سعدیا نوبتی امشب دہلی صبح نکوفت
 طاقت و عظ نباشد سر سودائی را
 ورنہ بیند چہ بود فائدہ بیٹائی را
 نہ چو دیگر حیوان سبزہ صحرائی را
 یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

☆☆☆

شبے و شمعے و گویندہ و زیبائے
 فرشتہ رشک برد بر جمال مجلس من
 ضرورتست بلا دیدن و جفا بردن
 قیامت ست کہ در روزگار ما برخاست
 دگر چہ بنی اگر رو ازو بگردانی
 وگر کنی نظر از دور کن کہ نزدیکست
 ندارم از ہمہ عالم جز این تمنائے
 گر التفات کند چون تو مجلس آرائے
 ز دست آنکہ ندارد بحسن ہمائے
 بہ راستی کہ بلا نیست آن نہ بالائے
 کہ نیست خوشتر از دور جہان تماشائے
 کہ سر بازی اگر پیشتر نمی پائے

☆☆☆

عالم کہ عارفان را گوید نظربد و زند
 زیرا کہ بادشاہے چون بقعہ بگیرد
 گر یار ما بہ بیند صاحب نظر باشد
 بنیاد حکم اول زیر و زیر باشد

دیوانہ را کہ گوئی ہشیار باش و عاقل ترسم کہ از نصیحت دیوانہ تر باشد
ساتی بیار جائے مطرب بگوی چیزی لب بر دہان نے نہ تا نیشکر باشد

☆☆☆

بہوی زلف تو بابا و عیش ہا دارم اگرچہ عیب کنندم کہ باد پیانیست
ترا ملاحتِ سعدی حلال کے باشد کہ بر کناری و او در میان دریانیست
الغرض شیخ سے پہلے تغزل کا میلان زیادہ تر عشق مجازی کی طرف تھا اور عشق مجازی کے متعلق بھی صرف وہ بیرونی اور ظاہری حالتیں بیان کی جاتی تھیں جو عام عشق بازوں کی زبان پر جاری ہوتی ہیں۔ شیخ نے اپنی غزل میں ایسی باتیں کم لکھی ہیں بلکہ وہ اکثر عشق و محبت کے پوشیدہ اسرار و غوامض اور عمیق کیفیات اور اندرونی حالات بیان کرتا ہے جو دلہنگی کے زمانہ میں ہر انسان پر گزرتے ہیں لیکن ہر شخص ان کو بیان نہیں کر سکتا بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گزر رہا ہے۔ مثلاً یہ بات عشق بازوں اور بوالہوسوں کے زبان زد ہوتی ہے کہ معشوق کی جدائی ایسی سخت چیز ہے جو کسی طرح اور کسی حالت میں برداشت نہیں کی جاسکتی لیکن یہ بات عام نظروں سے مخفی ہوتی ہے کہ وصل کی امید پر جدائی بسر کرنی ایسی مشکل نہیں ہے جیسی خیال کی جاتی ہے جیسا کہ شیخ کہتا ہے۔

اے کہ گفتمی چچ مشکل چون فراق یار نیست گر امید وصل باشد آنچنان دشوار نیست
یامثلًا جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور باوجود کمال اشتیاق کے وصل سے بہرہ مند نہیں ہوتے وہ عموماً عشق و محبت کی قید سے آزاد ہونے کی آرزوئیں کیا کرتے ہیں اور اُس موقع کو یاد کر کے پچھتاتے ہیں جب کہ دلہنگی کے سامان انھوں نے خود مہینا کیے تھے اور بار بار صورت دیکھنے یا باتیں سننے یا ربط بڑھانے سے ایک مردہ چنگاری کو زیادہ فروخت کیا تھا لیکن اُن کو یہ شعور بہت کم ہوتا ہے کہ اس جلن اور سوز میں کس قدر لذت چھپی ہوئی ہے اور یہ کہ اگر بالفرض ترک عشق و محبت پر اُن کو اختیار دے دیا جائے تو وہ ہرگز اس دلہند قید سے چھوٹنا گوارا نہیں کر سکتے جیسا کہ شیخ نے کہا۔

بر عندلیب عاشق گر بشکنی قفس را از ذوقِ اندر نوش پرواے در نباشد
یامثلًا عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ معشوق کے دیکھنے سے کبھی جی سیر نہیں ہوتا اور جب

تک وہ سامنے رہتا ہے عاشق اُس کے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا مگر یہ بات بہت کم خیال میں گزرتی ہے کہ عشاق کو بسا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ باوجود کمال اشتیاق کے معشوق کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے جیسا کہ شیخ کہتا ہے۔

دل و جانم تو مشغول و نگہ بر چپ و راست تا ندانند رقیبان کہ تو منظور منی
یا مثلاً عشاق کا عام خیال یہ ہے کہ دوست سے جب مدت کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو وہ شکوہ شکایت اور جدائی کی مصیبتیں بیان کرنے کا موقع ہوتا ہے مگر اس واقعی کیفیت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ جب دوست سے ملاقات ہوتی ہے تو اُس کے ملنے کی خوشی میں اکثر تمام شکوے اور جدائی کے صدمے یک قلم فراموش ہو جاتے ہیں چنانچہ شیخ نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم چہ گویم کہ غم از دل بردو چوں تو بیائی
غرض کہ ایسے گہرے خیالات سے قدما کی غزل بالکل معرا تھی۔ اول شیخ ہی نے ان مضامین کی بنیاد ڈالی ہے۔ تصوف و درویشی وغیرہ کے مضامین نے غزل میں اور بھی زیادہ لذت اور نمک اور درد بھر دیا۔ جن اصول پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی اُس کے بعد اکثر محفلین نے وہی اصول اختیار کیے کیونکہ اُن کے بغیر غزل کا سرسبز ہونا نہایت دشوار تھا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام ایران اور ترکستان اور ہندستان میں ایک آگ لگ گئی۔ ہر موزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گویوں کی تعداد حساب اور شمار سے زیادہ بڑھ گئی۔ ازاں جملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج پایا۔ علی الخصوص خواجہ حافظ شیرازی کی غزل نے اپنا وہ سکہ جمایا کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے یا فقر و درویشی کی چاشنی سے باخبر تھے یا راگ راگنی سے آشنا تھے یا شراب و کباب کا چکار کھتے تھے یا عاشق مزاج اور عیش دوست تھے سب جاں و دل سے اُس پر قربان ہو گئے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں، حال و قال کی مجلسوں میں، قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں، شعرا کی صحبتوں میں مشائخ کے حلقوں میں درود یوار سے لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ شیخ کی غزل نے فارسی شاعری میں ایک خاص قسم کی وسعت پیدا کی جس کے سبب سے قدرتی جذبات کا ایک طویل الذیل باب یعنی عشق و محبت کے

مضامین نہایت آب و رنگ کے ساتھ بیان کیے گئے۔ مگر اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ اس بادۂ ہوش رُبا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق، خیالات اور معاشرت پر کچھ اچھے اثرے مرتب نہ ہوئے شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو اور خواہ اخلاقی ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں ہمیشہ پڑھے اور گائے جاتے ہیں وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلاً شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں نمک اور حسن زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اُس کی تاثیر جلد اور پایدار ہوتی ہے۔ شیخ سعدی، خواجہ حافظ، امیر خسرو، میر حسن بخاری، مولانا جامی وغیرہم کی غزلیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ممالک اسلامیہ کے ایک بڑے حصہ میں عموماً پڑھی اور گائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان بزرگواروں کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف اور سلوک اور تصوف پر مبنی ہے۔ لیکن اُس میں مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں۔ جس طرح اُس سے ایک صوفی خدا پرست روحانی کیفیت اُٹھاتا ہے اسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی جذبات اُس کے سننے اور پڑھنے سے براہِ بیخستگی ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اُس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشق حقیقی کے ساتھ ہی عشق مجازی اور صورت پرستی و کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے مال و دولت، علم و ہنر، نماز روزہ، حج زکوٰۃ، زہد و تقویٰ غرض کہ کسی شے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل و تدبیر، مال اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے۔ اور آوارگی، رسوائی، بدنامی، بدستی بے سروسامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے۔ دولت دنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا، توکل و قناعت کے نشے میں اپنی ہستی کو مٹانا اور جوہر انسانیت کو خاک میں ملا دینا۔ دنیا و مافیہا کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجاب اکبر جاننا۔ حقائق اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا۔ کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا۔ جو کچھ ہاتھ لگے اُس کو فوراً رانگاں کھود دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اُس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکر و اور نوجوانوں کو بالطبع

مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے اُن کو لے اُڑتی ہے اور اُن کی تاثیر کو دس بیس گنا کر دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں جن کی تمام عمر حقائق اور معارف کے بیان کرنے میں گزری ہے اور جس کا شعر شریعت کا لُب لہاب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی دلنشیں زیادہ ہوتے ہیں۔ پس ممکن نہیں کہ شیخ اور اُس کے قبیعین کی غزل نے سوسائٹی کو اپنے جادو سے اچھوتا چھوڑا ہو۔ اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کو اکثر اُن صفات سے موصوف پاتے ہیں جن کی اس مجموعہ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے۔ عشق بازی، حُسن پرستی اُن کے ساتھ اس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف دولت مند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اس کا چکار کھتے ہیں۔ اور نہ صرف نوجوان بلکہ معمر لوگ بھی اُس کا دم بھرتے ہیں۔ فضول خرچی، ناعاقبت اندیشی، عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا۔ توکل اور قناعت کے دھوکے میں معاش کی کچھ فکر نہ کرنی۔ غیر قوموں کی ترقی کا ذکر نہ کر دینا و مافیہا کو پیچ و پوچ بتانا۔ عقل انسانی کو حقائق اشیا کے ادراک سے عاجز جاننا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک دھوکا سمجھنا وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی عام خاصیتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیتیں اسی شعر و غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ شاید اس کے اصلی اسباب کچھ اور ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوفانہ اشعار نے اس حالت کی ترقی دینے میں بہت کچھ مدد پہنچائی ہے۔

سٹیون صاحب نے جو کلکتہ روپو مورخہ جون 1756ء میں خوبہ حافظ کا حال لکھا ہے اُس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے جس کا نقل کرنا اس مقام پر شاید بے موقع نہ ہو گا وہ لکھتے ہیں کہ سعدی جو کہ حافظ کا چچا ہے ایک روز وہ اور حافظ کسی جگہ بیٹھے تھے اور سعدی غزل لکھ رہا تھا جس کا پہلا مصرعہ حافظ کی بھی نظر پڑ گیا۔ اتفاقاً اُسی وقت سعدی کسی کام کے لیے وہاں سے اُٹھ گیا اور اپنی غزل کا کاغذ ساتھ لے گیا۔ حافظ نے اُس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگا کر اور پوری بیت ایک پرچے پر لکھ کر وہاں چھوڑ دی۔ اور آپ چل دیا۔ شیخ نے پھر وہاں آکر حافظ کو نہ پایا

مگر وہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس میں سعدی پر کچھ چوٹ کی تھی۔ سعدی اس بات سے ناخوش ہوا اور حافظ کو بلا کر پوچھا کہ یہ شعر تو نے لکھا ہے؟ اُس نے کہا ہاں! شیخ نے اُس سے ساری غزل پوری کرائی اور جب وہ غزل سُنی تو اُس کو بدعادی کہ ”جو شخص تیری غزل پڑھے گا وہ عقل سے بیگانہ رہے گا“ اس کے بعد صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے اکثر شیعہ مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ بیشک سعدی کی بدعاد حافظ کے حق میں مستجاب ہوئی۔ کیونکہ اُس کے ہر ایک شعر میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”حکایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حافظ کی غزل سے دیوانگی اور وحشت پیدا ہوتی ہے۔“ میں کہتا ہوں کہ یہ خیال تو شاید غلط نہ ہو مگر یہ حکایت قطعی غلط ہے کیونکہ شیخ اور خواجہ کی وفات میں پورا ایک صدی کا آگامیچھا ہے قسطنطنیہ کے شیعوں کا خیال میرے نزدیک اس اعتبار سے صحیح ہے کہ خواجہ حافظ کی غزل کی ممارست اور مزاوت سے بیشک ابرار و احرار کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا نہایت پختہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور ادب و باش والوط کو بے فکری، نا عاقبت اندیشی، عشق بازی، بدنامی و رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر ہی ویسی ہی خانہ برانداز اور خانماں سوز ہے جیسی دوسری۔ ہر زمانہ کا جدا جدا اقتضا ہوتا ہے۔ جب دولت مند اور ذی اقتدار لوگ دنیا طلبی اور حب جاہ میں سراسر منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور جسمانی خوشیوں میں محو ہو کر روحانی مسرتوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور عقل و شریعت کے احکام معطل ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں اُس وقت البتہ یہ امید ہو سکتی ہے کہ ایسی ترغیبات سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ تمام قوم کم ہمت اور پست حوصلہ ہو گئی ہو اور اولوالعزمی کا ختم اُن کی طبیعت میں جل گیا ہو۔ اور جب کہ تمام دنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجہ ہوں اُس وقت دنیا سے اُن کا دل سرد کرنا اور قناعت اور توکل کا اُن کو سبق پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹھٹھاتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اُس کو گل کر دینا۔ پس ممکن ہے کہ شیخ اور اُس کے قبعین کی غزل نے اُس زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے دماغ میں نشہ جاہ و بغوی عروج پر تھا کچھ مفید نتائج پیدا کیے ہوں لیکن اس زمانہ میں میرے نزدیک اس سے ضرر کا اندیشہ ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شیخ اور حافظ کی غزل پر کچھ اعتراض کرنا مقصود ہے بلکہ اس سے اُن کی کمال سحر بیانی اور سیف زبانی ثابت ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہی ہے کہ جو کچھ کہے لوگ اُس سے متاثر ہوں نہ یہ کہ اُس سے کبھی مضرت ناسخ پیدا نہ ہونے پائیں۔ باروت نے باوجودیکہ بنی آدم کی ہزاروں جانیں تلف کی ہیں اور شراب نے بے شمار آدمیوں کو اخلاقی اور جسمانی مضرتیں پہنچائی ہیں بائیں ہمہ ان کے موجدوں کی دانشمندی کا تمام دنیا اعتراف کرتی ہے اور کرے گی۔

قصائد وغیرہ

اس مجموعے میں شیخ کے مدحیہ قصیدے، مرثیے، ترجیع بند ملمع اور مثلث جمع کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ غزلیات کی نسبت بہت تھوڑا ہے۔ شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی۔ یا تو اُس کی طبیعت ہی کو قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گون نہ تھی۔ اور یا اُس نے مدح و ستائش کے طریقہ مروج کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا مگر چونکہ اُس زمانے کے دستور کے موافق ایک ایسے نامور شاعر کو جیسا کہ شیخ تھا کچھ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا اس لیے اُس نے کسی قدر قصائد لکھے ہیں جو کہ پہلے قصیدہ گویوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں۔

شیخ سے پہلے جو حالت قصیدہ گوئی اور مدحیہ کی مسلمانوں میں تھی اُس کی تفصیل کرنے کا یہاں محل نہیں مگر مختصر یہ ہے کہ منصور بن مہدی عباسی خلیفہ بغداد کے زمانے سے شعر اکو نہایت گراں بہا صلے اور انعام ملنے لگے تھے۔ ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ درہم شاعروں کو مل جاتے تھے خلفا اور امرا کو اپنی تعریفیں سننے کا ایسا شوق ہو گیا تھا کہ اُن کا مدح کسی اور شخص کی مدح میں زیادہ مبالغہ کرتا تھا تو اُن کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور اگر تشبیب میں زیادہ شعر لکھ لاتا تو شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ طبیعت کا سارا زور تو خال و خط کی تعریف میں خرچ کر دیتے ہیں صرف کچھ بچے کچھ خیالات ہمارے سہارے ہیں۔ ہزاروں علما و فضلا نے قصیدہ گوئی اور مدحیہ کو اپنا پیشہ ٹھہرا لیا تھا اور شاعری میں شہرت ہو جانے کے بعد کسی کو اس بات سے چارہ نہ تھا کہ ذی اقتدار لوگوں کی مدح سرائی میں خامہ فرسائی کرے۔ شعر اتمام ممالک اسلامیہ میں اس امید پر سفر کرتے تھے اور قصیدہ گوئی کی بدولت اطراف و جوانب سے مال و دولت جمع کر کے لاتے تھے۔

عباسیوں کے علاوہ فاطمی، دیلمی، کروی، طاہری، صفاری، سامانی، غزنوی، سلجوقی، خوارزم شاہی وغیرہ تمام سلسلوں میں مداحوں کی نہایت قدر کی جاتی تھی۔ ایران میں بھی

سامانیوں کے عہد سے پہلے تو عربی قصائد ہی کا زور و شور رہا مگر سامانیوں کے زمانے میں ایران کی شاعری کا مدار زیادہ تر فارسی زبان پر آٹھیرا۔ فارسی قصیدے نے بھی خوب رواج پایا۔ ظہیر، رشید، خاقانی اور انوری وغیرہم نے فارسی قصیدے میں وہی شہرت حاصل کی جو عربی میں متنتی، ابوتمام، بختری اور ذالرمۃ نے حاصل کی تھی۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ سعدی جیسے مشہور شاعر کو سلاطین و امراے عہد کی تعریف میں قصیدہ لکھنا ایسا ہی ضروری تھا جیسے درباریوں کو جشن اور تہواروں میں نذر دکھانا مگر قصیدے کی حالت اُس وقت ایسی بُری تھی کہ شیخ کو اپنی جہتی استقامت اور بنییدگی کے سبب اُس روش پر چلنا دشوار تھا۔ مدوح کی ستائش میں سراسر عقل و عادت کے خلاف مبالغے کیے جاتے تھے۔ الفاظ کی سادگی اور بے تکلفی قصائد میں مذموم سمجھی جاتی تھی۔ مسائل علمیہ اور مقدّمات حکمیہ اور سلوک و تصوف کے دقائق اور علوم مختلفہ کی اصطلاحیں اظہار علم و فضل کے لیے اُن میں بالقصد داخل کی جاتی تھیں۔ صنایع لفظی خصوصاً تجنیس و ترصیع وغیرہ کو اُن کا زیور سمجھتے تھے۔ شیخ کی آزادی اور حق گوئی خصوصاً سادہ بیانی جو اُس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی اِن تکلفات لائینی سے مانع تھی اُس کے کلام سے جا بجا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مبالغہ اور خوشامد کو نہایت ناپسند کرتا تھا۔ ظہیر فارابی نے قول ارسلان کی مدح میں ایک جگہ یہ شعر لکھا ہے۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیرِ پائے تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلان دہد
شیخ بوستان میں جہاں اتا تک ابوبکر سعدی کی تعریف لکھتا ہے وہاں ظہیر کے اس شعر پر اس طرح تعریف کرتا ہے۔

براہ تکلف مرو سعدیا اگر صدق داری بیار و بیا
تو منزل شناسی و شہ راہ رو تو حق گو و خسرو حقائق شنو
چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان نہی زیرِ پائے قزل ارسلان
گو پائے عزت بر افلاک نہ بگو روئے اخلاص بر خاک نہ

اس کے سوا اور اکثر جگہ اُس نے مذراح پیشگی سے نفرت اور اعراض ظاہر کیا ہے۔ اُس کے ایک قطعہ کا یہ مضمون ہے کہ ”لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اے سعدی تو کیوں سختیاں اٹھاتا

ہے اور کیوں اپنے کمال شاعری سے متمتع نہیں ہوتا؟ اگر تو مدح گوئی اختیار کرے تو نہال ہو جائے۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی رئیس یا امیر کے دروازے پر اپنا مطلب در یوزہ گروں کی طرح لے جاؤں۔ اگر ایک جو بھر ہنر کے عوض میں کوئی مجھ کو سونخڑا نے بخش دے تو وہ مستحق شکر ہے اور میں قابلِ نفیر۔“

شیخ کو قطع نظر اس کے کہ مبالغہ اور خوشامد سے نفرت تھی کوئی ضرورت بھی ایسی داعی نہ تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اگلی بھیڑوں کے پیچھے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہو جاتا اور قصیدہ گوئی کا جو اُس وقت کمال سمجھا جاتا تھا اُس کے حاصل کرنے میں مقتضائے طبیعت کے خلاف کوشش کرتا۔ وہ سلطانی خدمات سے ہمیشہ متنفر رہتا تھا اور اپنے دوستوں کو اس سے باز رکھنے میں کوشش کرتا تھا۔ پس اُس کو اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ قصیدہ کو مقبول خاص و عام بنائے اور اس ذریعہ سے دربار میں تقرب حاصل کرے جتنے نامی قصیدہ گوایران میں گزرے ہیں سب بادشاہوں کے ہاں اس خدمت پر مامور رہے ہیں کہ خوشی کی تقریبوں میں طوفان کے تو دے بنا کر لائیں اور اُن میں جس قدر زیادہ مبالغہ اور جھوٹ کو کام فرمائیں اُسی قدر گراں بہا صلے اور انعام پائیں۔ چنانچہ ظہیر قزل ارسلان کے ہاں، انوری سلطان سنجری کے ہاں، رشید و طواط خوارزم شاہ اُتمز کے ہاں اور خاقانی شروان شاہ کے ہاں ملک اشعرا تھے۔ ان لوگوں کی تمام طاقت اور لیاقت قصیدہ گوئی میں صرف ہوتی تھی اور اُن کی ترقی اور تقرب کا مدار صرف اُن باتوں پر تھا جو اُس زمانے میں قصیدہ گوئی کے لیے ضروری تھیں یہی سبب ہے کہ قصیدہ کے سوا کوئی بڑی یادگار انھوں نے نہیں چھوڑی۔

پس اگرچہ شیخ جیسے مشہور اور نامور شاعر کو اُس زمانے کے دستور کے موافق کچھ نہ کچھ قصیدہ کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ لیکن اُس کو دیے جموٹے اور نمایشی طلم باندھنے کچھ ضرور نہ تھے جیسے کہ انوری اور ظہیر وغیرہ نے باندھے ہیں۔ اسی لیے غلطی سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شیخ کو قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا۔ میں ہرگز اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کو معمولی چمک دمک کے ساتھ قصیدہ لکھنے پر قدرت نہ تھی بلکہ میرے نزدیک جس طرح رولر میز حائط کھینچنے سے مانع ہوتا ہے اُسی طرح طبیعت کی استقامت کبھی بے راہ نہیں چلنے دیتی۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی میں جس قدر قصیدہ حد شاعری سے مجاوز ہو گیا ہے ایسی اور کوئی صنعت نہیں ہوئی۔ مذہبی قصائد

سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہیے کہ ممدوح کی صفات کو سن کر خاص و عام کے دل میں اُس کی محبت اور اُس کے ساتھ خُسنِ ظن پیدا ہو اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیے کہ اگر وہ صفتیں اُس میں موجود ہوں تو اُن میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم اُن کو اُسی حال پر قائم رکھے اور اگر نہ ہوں تو اُن کے حاصل کرنے میں کوشش کرے یہ مطلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو صفات کہ مدح میں ذکر کی جائیں وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی الواقع موجود ہوں یا اُن کے موجود ہونے کا احتمال ہو۔ ورنہ ممدوح کے دل میں اُس مدح کی وقعت ایک جھوٹ سے زیادہ نہ ہوگی۔ مثلاً ظہیر فاریابی نے جو قزل ارسلان کی مدح میں یہ لکھا ہے کہ ”تصور جب ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی کو طے کر لیتا ہے تب جا کر قزل ارسلان کی رکاب پر بوسا دیتا ہے۔ اس سے قزل ارسلان کے دل پر سوا اس کے کہ اُس کو ایک جھوٹ سمجھا ہو اور کیا اثر ہوا ہوگا۔ یا مثلاً انوری جو محمد الدین ابوالحسن کی شان میں لکھتا ہے کہ ”اگر وہ زمانہ گزشتہ کو رجعت کا حکم دے تو پھر کر زمانہ آئندہ کی جگہ آجائے“ اس سے ابوالحسن کے دل میں سوا اس کے کہ مدح مجھ کو بناتا ہے یا میرا خا کا اُڑاتا ہے اور کیا خیال گزرا ہوگا۔ یہی حال اُن تمام قصیدہ گوئیوں کی مدح کا ہے جن کو ایران اور ہندستان وغیرہ میں سب نے تسلیم کیا ہے۔ شیخ نے نہ عدم قدرت کے سبب بلکہ فرط کراہت کے سبب مدح و ستائش کے اِس ناپسندیدہ طریقہ کو اختیار نہیں کیا۔ اُس نے قصائد بھی اُسی اپنی شیریں زبانی اور سادہ بیانی و بے تکلفی کے ساتھ جو کہ اُس کے کلام کی عام خاصیت ہے لکھے ہیں۔ اُس کے قصائد سے کمال آزادی اور حق گوئی ثابت ہوتی ہے۔ اُس نے اکثر قصیدے اور ترجیع بند وغیرہ محض محبت اور غلوس اور دلی جوش سے لکھے ہیں۔ نہ خوشامد کی راہ سے اور نہ صلہ و انعام کی اُمید پر۔ باقی جس قدر قصیدے ضرورتِ سلاطین عہد اور حکام وقت کی شان میں لکھے ہیں اُن کے اسلوب بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اُس نے اہل دنیا کی تنبیہ اور نصیحت و پند کے لیے قصیدہ کو اُن سے خطاب کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا تھا۔ کیونکہ وہ بالکل مواعظ و نصائح سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض قصیدوں میں پند و اندرز کے سوا مدحیہ اشعار دو چار سے زیادہ نہیں۔ یہ وہ قصیدے ہیں جو اُس نے اپنے دوست اور معتقد امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ تاحر د کیے ہیں۔ ان کے سوا اور قصیدوں میں اول مدح و ستائش کی چاٹ دے کر پھر نصیحت کرنی شروع کی ہے۔

شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ اور اُس کی علت غائی جو اُس نے قرار دی تھی ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتی ہے۔

اتابک ابوبکر بن سعد زنگی جو فارس کا بادشاہ تھا اور شیخ اُس کی رعایا میں سے تھا اُس کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے۔

نبوت اند ملوک اندرین سپنج سرائے کنون کہ نوبت تست اے ملک بعدل گرائے
چہ مایہ بر سر این ملک سردران بودند چو دور عمر بسر شد در آمدن از پائے
نیاز باید و طاعت نہ شوکت و ناموس بلند بانگ چہ سود و میان تہی چو درائے
بہ تیغ و نیزہ گرختند جنگجویان ملک تویر و بحر گرفتنی بعدل و ہمت و رائے
چو ہمت است چہ حاجت بہ گرز مغرکوب چو دولت است چہ حاجت بہ تیر جوش خائے
عمل پیار کہ رحمت سرائے آخرت است نہ عود سوز بکار آیت نہ عنبر سائے
ہر آنکست کہ بہ آزار خلق فرماید عدوے مملکت است آن بکشتش فرمائے
بکامہ دل دشمن نشیند آن مغرور کہ بشنود سخن دشمنان و دوست نمائے
دیار مشرق و مغرب بگیر و جنگ مجوے دلے بدست کن وزنگ خاطرے بزدائے
نگویمت چو زبان آوران رنگ آمیز کہ ابر مشک فشانی و بحر گوہر زائے
نکابد انچہ نوشتہ است عمر و نفزاید پس اینچہ فائدہ گفتن کہ تا بکشر پائے

دوسرے قصیدہ میں چند مدحیہ شعر لکھ کر اتابک ابوبکر کی طرف اس طرح خطاب کرتا ہے۔

مدح شیوہ درویش نیست تا گویم کہ ہجو بحر عیسیٰ و ابر آزادی
نگویمت کہ بفضل از کرام متازی نگویمت کہ بعدل از ملوک مختاری
و گرچہ این ہمہ ہستی نصیحت اولیٰ تر کہ پند راہ خلاص است و دوستی یاری
بسی کوش کہ نامہ فراغت نبود کہ سر بخاری، اگر روے شیر زخاری
خدائے یوسف صدیق را عزیز نہ کرد بخوبروی - و لیکن بنجب کرداری
شکوہ لشکر و جاہ و جلال و مالت ہست دلے بکار نیاید بجز نکو کاری
بقائے مملکت اندر وجود یک حرفست کہ دست پنج قوی بر ضعیف نگاری

پس از گرفتن عالم چو کوچ خواهد بود رواست گر ہمہ عالم گرفتہ انگاری
 بہ نیک و بد چو باید گزشت آن بہتر کہ نیک نام بدست آوری و بگزاری
 ہزار سال گویم بقائے عمر تو باد کہ این مبالغہ دائم ز عقل شماری
 ہمین سعادت و توفیق بر حریت باد کہ حق گزاری و ناحق کے نیازی

اتابک سلجوق شاہ بن سلغرشاہ جو اتابکوں کے خاندان میں بڑا عالم بادشاہ گزرا ہے
 اور جو آخر کو اپنے ظلم کے سبب قتل کیا گیا اُس کی مدح میں چند شعر لکھ کر کہتا ہے۔

مراد سعدی از انشاد و زحمت خدمت نصیحت است بسبع قبول شاہشاہ
 دوام دولت و آرام مملکت خواہی ثبات راحت و امن مزید و رفعت و جاہ
 کمر بطاعت و انصاف و عدل و عفو بہ بند چو دست رحمت حق بر سرت نہادہ کلاہ
 تو روشن آئینہ ز آہ و درومند بہ ترس عزیز من! کہ اثر میکند در آئینہ آہ
 معلمان بد آموز را سخن مشو کہ دیر سال بمانی بکام نیکی خواہ

ایل خان یعنی ہلاکو خان یا اُس کے بیٹے ابا قاقان کی شان میں جن کی ہیبت سے روم و
 روس و چین کے بادشاہ لرزتے تھے مدحیہ اشعار کہہ کر لکھتا ہے۔

ہر نوبتے نظر بہ یکے مے کند سپہر ہر مدتے زمین بہ یکے میدہد امان
 بچے نشان کہ دولت باقیست بر دہد کاین بارغ عمر گاہ بہارست و مگر خزان
 اے بادشاہ روئے زمین دور از آن تست اندیشہٴ ثقلب دوران کن و زمان
 چون کام جاودان مصور نے شود حرم کیسکہ زندہ کند نام جاودان
 نادان کہ بخل مے کند و گنج مے نہد مزدور دشمن ست تو بر دوستان فشان
 یا رب تو ہر چہ راے صوابست و فعل خیر اندر دل وے آنگن و بردست وے بر آن
 آہوئے طبع بندہ چنین مشک میدہد کز پارس میہند بہ تاتارش ارمغان

سردار اعلیٰ جو خاندان اتابک کے زوال کے بعد سلطان ابا قاقان پر ہلاکو خان
 کے حکم سے فارس کا فرمان روا مقرر ہوا تھا اور اپنے قدیم تاتاری مذہب پر نہایت چٹنگی سے

ثابت قدم تھا اُس کے شان میں جتنے قصیدے شیخ نے لکھے ہیں اُن میں متعدد اشعار کے سوا باقی تمام نصیحت و پند مندرج ہے ازاںجملہ ایک قصیدہ میں بہت سے مواعظ و نصائح کے بعد لکھا ہے۔

حرامش باد ملک و بادشاہی کہ پیش مدح گویند از قفا ذم
عروس زشت زیبا کے توان کرد وگر برخود کند دیبائے مُغْلَم
اگر مردم ہمیں بالا و ریش اند بہ نیزہ نیز بر بستہ ست پرچم
چنین پند از پدر نصییدہ باشی الا گر ہوشیاری بشنو از عم
چو یزدانت مکرم کرد مخصوص چنان زی در میان خلق عالم
کہ گر دقتے میان بادشاہست نباشد ہیچان باشی مکرم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ سخن ملکہ ست سعدی را مسلم
مقامات از دو بیرون نیست فردا بہشت جادوانی یا جہنم
سلجوق شاہ جس کا ذکر او پر ہو چکا ہے اُس کی مدح کو ایک اور قصیدہ میں اس طرح ختم کیا

ہے۔

جہان نماند و آثار مملکت ماند بخیر کوش و صلاح و بعدل کوش و کرم
کہ ملک و دولت ضحاک بیکہ آزار نماند و تا بہ قیامت برو بماند رقم
خطائے بندہ گمیری کہ مہتران و ملوک شنیدہ اند نصیحت ز کہتران خدم
خنگ کیکہ پس از دے حدیث خیر کنند کہ جز حدیث نمی ماند از بنی آدم
ان کے سواے جو قصیدے خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کے بھائی
خواجہ علاء الدین جوینی اور مجد الدین رومی اور فخر الدین ابوبکر وغیرہم کی شان میں ہیں۔ اُن
میں مدح اکثر برائے نام ہے زیادہ تر نصیحت و پند ہے اور بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو
کسی کی مدح میں نہیں ہیں اُن میں صرف نصائح و مواعظ یا فصل بہار کا سماں یا معشوق کی
تعریف یا حمد الہی وغیرہ مندرج ہے۔

ایک مختصر قصیدہ اول سے آخر تک بھی اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مدح
اور نصیحت دونوں کا ڈھنگ معلوم ہو۔

مدح و موعظہ مجدد الدین رومی

جہان بر آب نہادست زندگی بر باد
 جہان نماند و خرم روان آدمے
 سرائے دولت باقی نعیم آخرتست
 کدام عیش درین بوستان کہ باد اجل
 حیات عاریتے خانہ ایست در رہ سیل
 بے برآید و بے مافرو شود خورشید
 ہر آنچہ میگزرد دل منہ کہ دجلہ بے
 گرت نہ دست برآید چو نعل باش کریم
 بے بدیدہ حسرت ز پس نگاہ کند
 وجود خلق بدل میکند ورنہ زمین
 چو طفل بر ہمہ بازید و بر ہمہ خندید
 عروس ملک کور وئے دختریت ولے
 نہ خود سریر سلیمان بباد رفتے و پس
 ہمین نصیحت من گوشدار و نیکی کن
 نداشت چشم بعیرت کہ گرد کرد و نخورد
 چنان کہ صاحب فرخندہ راے مجدد الدین
 گنجینت بہ تکلف فلان بدولت و دین
 تو آن برادر صاحب دلی کہ مادر دہر
 بہ روزگار تو قیام دست فتنہ بہ بست
 غلام ہمت آنم کہ دل برو نہ نہاد
 کہ باز ماند ازو در جہان بہ نیکی یاد
 زمین سخت نگہ کن چو ی نہی بنیاد
 ہے برآورد از بخ قلمت شمشاد
 چراغ عمر نہادہ است بر درمچہ باد
 بہار گاہ خزان باشد و گہے مرداد
 پس از خلیفہ بخواد گزشت در بغداد
 ورت بدست نباشد چو سرو باش آزاد
 کیسکہ برگ قیامت ز پیش نفرستاد
 همان ولایت کچھروست ملک قباد
 عجب تر آنکہ نہ کشند دیگران اُستاد
 وفا نمے کند این ست مہر بادا باد
 کہ ہر کجا کہ سریریت می رود بر باد
 کہ دائم از پس مرگم کنی بہ نیکی یاد
 بہر دو گوے سعادت کہ صرف کرد و بداد
 کہ بخ اجر نشاند و بنائے خیر نہاد
 سپہر مجد و معالی جہان دانش و داد
 بہ سالہا چو فرزند نیکیخت نہ زاد
 بہ یمن تو در اقبال بر جہان بکشد

دلیل آنکہ ترا از خدائے نیک آید بس ست خلق جہان را کہ از تو نیک افتاد
یکے دعا گشت بے رعونت از سر صدق خدات در نفس آخرین بیمار زاد
تو ہم زیان نہ کنی گر بصدق دل گوئی کہ آفرین خدا بر روان سعدی باد

ایک ترجیع بند کے کچھ اشعار بھی جو کہ شیخ نے سعد¹ بن ابوبکر کے مرثیہ میں لکھے ہیں اور جو کلیات میں غلطی سے امیر فخر الدین ابوبکر کے نام پر لکھ دیا گیا ہے بطور نمونہ کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

غریبان را دل از بہر تو خون ست دل خویشان نمی دامن کہ چون ست
عنان گریہ چون شاید گرفتن کہ از دست شکیبائی برون ست
مگر شاہدہ اندر قلب لشکر نمی آید کہ رایت سرگون ست
شکیبائی مجو از جان مجبور کہ بار از طاقت مسکین فزون ست
سکون در آتش سوزندہ گفتم شاید کرد ، درمان ہم سکون ست
کہ دنیا صاچے بد عہد و خو خوار زمانہ مادرے بے مہر و دون ست
نہ اکنون ست بر ما جور لیام کہ از دوران آدم تا کنون ست

نمی دامن حدیث نامہ چون است

ہی ہنم کہ عنوانش بخون ست

بزرگان چشم و دل در انتظار اند عزیزان وقت و ساعت می شارند

1۔ امیر فخر الدین ابوبکر اتابک ابوبکر کے امراے نامہ دار میں سے تھا جو ادنیٰ درجے سے مصطب امارت بلکہ مشارک ملک تک پہنچا تھا اور سعد ابوبکر اتابک کا بیٹا تھا جس زمانہ میں ہلاکو خان نے بغداد کو فتح کیا تھا ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد ابوبکر کو اظہار دوستی و غیر خواہی کے لیے بغداد میں بھیجا تھا جب وہاں سے باعز از تمام رخصت ہوا تو راہ میں باپ کے مرنے کی خبر سنی جس سے اور ولی عہدوں کی طرح اُس کو خوش ہونا چاہیے تھا مگر اُس کو اس خبر سے ایسا صدمہ ہوا کہ ادھ ہی میں سخت بیمار ہو گیا اور رستے ہی میں باپ کی وفات سے بارہ روز بعد مر گیا۔ اُس کی سوتلی جب شیراز میں آئی تو شیخ نے یہ مرثیہ لکھا ہے جیسا کہ ترجیع کے شعر سے ظاہر ہے۔ سعد کے بعد اُس کا بیٹا اتابک محمد مظفر اُس کا جانشین ہوا۔

غلامان دُر و گوهر می فشانند کنیزان دست و ساعد می نگارند
 ملک خان و مساق و بدر و ترخان برهواران تازی بر سوارند
 که شاهنشاه عادل سعد بوکر به ایوان شهنشاهی درآرند
 حرم شادی کنان بر طاق و ایوان که مروارید بر تابش ببارند
 زمین می گفت عیثی خوش گزاریم ازان پس آسان گفت آزر گزارند
 امید تاج و تحجب خسروی بود ازین غافل که تابوش درآرند
 چه شد پاکیزه رویان حرم را که بر سر گاه بر زیور غبارند
 نشاید پاره کردن زیور دروے که مردم تحجب امر کردگارند
 و لیکن باچنین داغ جگر سوز نمی شاید که فریادے ندارند
 دلے شاید که مجبوران بگریند روا باشد که مظلومان بزارند

نمی دانم حدیث نامه چون ست
 ہی پنم کہ عنوانش بخون ست

پس از مرگ جوانان گل مماناد پس از گل در چن بلبل مخواناد
 کس اندر زندگانی قیمت دوست نداند، کس چنین قیمت مداناد
 سرآمد روزگار سعد بوکر خداوندش برحمت در رساناد
 به تلخی رفت از دنیاے شیرین زلال کام در حلقش چکاناد
 جزائے مرده رفتن در غربی شراب از دست پیغمبر ستاناد
 درین گیتی مظفر شاه عادل محمد نام بردارش بماناد
 سعادت پرتو نیکان دهاش بخوے صالحانش پروراناد
 روان سعد را با جان بوکر به اوج روح و راحت گستراناد
 بکام دوستان و بخت و فیروز بے دوران دیگر بگوراناد

نمی دانم حدیث نامه چون ست
 ہی پنم کہ عنوانش بخون ست

صاحبیہ

یہ مجموعہ شیخ کے متفرق اشعار کا سونفہ کے قریب ہے جس میں قطعہ، رباعی، فرد، ملمع، مثنوی وغیرہ جمع کی گئی ہیں۔ چونکہ شیخ کے ساتھ خواجہ شمس الدین حسین صاحب دیوان کو کمال خلوص اور عقیدت تھی اس لیے شیخ نے اس مجموعہ کا نام صاحبیہ رکھا۔

ان اشعار میں کوئی نئی خصوصیت نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے بیشتر اشعار فصاحت و پند پر اور کسی قدر حسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند قطعے اور رباعیاں جو سرسری نظر میں اچھی معلوم ہوئیں نقل کی جاتی ہیں۔

قطعات

تفرس کسان

ناکسان را فراتے ست عظیم گرچہ تاریک طبع و بد خویند
چون دو کس مشورت کنند بہم گوید این عیب من ہی گویند

☆☆☆

خصائل گان

سگے شکایت ایام با یکے میکفت نہ پنم کہ چہ برگشتہ حال و مسکینم
نہ آشیانہ چو مرغان نہ غلہ چوں موران قائم صفت و بردباری آیینم
گرم دہند خورم ورنہ میروم آزاد نہ ہم چو آدمیان خشناک بنشینم
مرانہ برگ زمستان نہ عیش تابستان کفایت ست ہمین پوشتین پارینم
نہ در ریاضت و خلوت مقام میسازم کہ جایگاہ کلوخ ست و سنگ بالینم
بہ قہمہ کہ تناول کنم ز دست کسے رواست گر بزند بعد ازان بہ ژوپنم

چو گر بہ در نہ رہا بم زدست مردم چیز دور اوفادہ بود ریزہ ریزہ بر چینم
 بجائے من کہ نشید کہ در مقام رضا برابر ست گلستان و قل سر گینم
 مرا کہ سیرت ازین جنس و خوبدین صفت ست چہ کردہ ام کہ سزاوار سنگ و نفرتیم
 جواب داد کزین پیش نعتِ خویش گو کہ خیرہ گشت زو صفت زبانِ تحسینم
 ہمین دو خصلت ملعون کفایت کہ ترا غریب دشمن و مُردار خوار سے بینم

☆☆☆

راحت بعد از مشقت

نظر کردم بہ چشمِ راے و تدبیر ندیدم بہ زخاموشیِ خصالے
 گویم لب بہ بند و دیدہ بردوز و لیکن ہر مقامے را مقالے
 زمانے بحثِ علم و درس و تنزیل کہ باشد نفسِ انسان را کمالے
 زمانے شعر و شطرنج و حکایت کہ خاطر را بود دفعِ ملالے
 خدایت آنکہ ذاتِ بے مثالش نگردد ہرگز از حالے بحالے

☆☆☆

ہمدردی نئی نوع

رحم اللہ معشر الماخذین کہ ہمدردی قدم سپردندے
 راحتِ نفسِ بندگانِ خداے راحتِ جانِ خود شمر دندے
 آن عزیزانِ چو زندہ می نشوند کاش این تا کسانِ ہمدردندے

☆☆☆

انجام ظالمان

بس دست دعا بر آسمان بود تا پائے برآمدت بہ سچے
 اے گرگ نہ گفتمت کہ روزے بہ سر افتد پلٹے

☆☆☆

حقوقِ پدران

اے طفل کہ دفعِ مگس از خود نتوانی ہر چند کہ بالغ شدی آخر نہ ہمانی

شکراتہ زور آوری روز جوانی آنت کہ قدر پدر پیر بدانی

☆☆☆

شان رزاقی

صانع نقش بند بے مانند کہ ہمہ نقش او نکو آید
رزقی طائر نہاد در پر و بال کہ بہر طعمہ فرد آید
روزی عنکبوت را بہ گس پر دہد تا بہ نزد او آید

☆☆☆

ولی خان

الحق امانے مال ایام ہچون تو حلال زادہ یابند
ہرگز زن و مرد کفر و اسلام نفس از تو پلید تر نہ زائد
ظفان ترا پدر بمراد تا جور وصی بیازماید
اطفال عزیز ناز پرورد از دست تو دست بر خدایند

☆☆☆

خالم حمام در حق خود

امیر ماعسل از دست غلق می نخورد کہ زہر در قدح انگبین تواند بود
عجب کہ در عسل از زہر میکند پرہیز حذر نمیکند از تیر آہ زہر آلود

☆☆☆

ترحم بر بیوگان

شنیدم کہ بیوہ زنہ دردمند ہے گفت و رخ بر زمین می نہاد
ہر آن کہ خدا را کہ بر بیوہ زن ترحم نباشد زلش بیوہ باد

☆☆☆

منع دشنام

ہر بد کہ بخود نمی پسندی باکس کن اے برادر من
گر مادر خویش دوست داری دشنام مہ بہ مادر من

مدافعت دشمن

مقابلت نکند با حجر بہ پیشانی مگر کسے کہ جہور کند بنادانی
کس این خطانہ پسند کہ دفع دشمن خود توانی و کنی یا گنی و نتوانی

☆☆☆

مطابہ

شنیدہ ام کہ فقہی بہ دشتبانے گفت کہ بیچ خریزہ داری رمیدہ و گفت آری
ازین طرف دو بہ دانگے، گر اختیار کنی وزن آن، چہار بہ دانگے قیاس کن بارے
سوال کرد کہ چندین تفاوت از پے چیست کہ فرق نیست میان دو نوع بسیارے
بگفت از انچه تو بینی حلال و ملک من است نیامدہ ست بدستم بوجہ آزارے
وزان دگر پسرانم بغارت آوردند حرام را نبود نزد شرع مقدارے
فقیہ گفت۔ حکایت دراز خواهی کرد ازین حرامترت ہست صد بہ دینارے

☆☆☆

احسان دوستی

تا سگان را وجوہ پیدا نیست مشفق و مہربان یک دگر اند
قلمہ در میان شان انداز کہ تہی گاہ یکدگر بدرند

☆☆☆

رباعیات

پاس مہد

شب نیست کہ چشم آرزو مند تو نیست وین جان بلب رسیده در بند تو نیست
گر تو دگرے بجائے من بگزینی من عہد تو نفلکم کہ مانند تو نیست

☆☆☆

تاسف بر عمر گزشتہ

ماہی اُمید عمر از شت برفت بے فائدہ روزم چو شب سُست برفت
عمرے کہ ازو دے بجائے ارزد افسوس کہ رانگنم از دست برفت

☆☆☆

انجامِ عالم

از بس کہ میازرد دل دشمن و دوست کوئی بکناہِ مسخ کردنش پوست
وقعِ غم او بر دلہا بودے اکنون ہمہ غم ہائے جہان بردل اوست

☆☆☆

فصلِ دوست بر ہمسجہ

گویند ہوائے فصلِ آواز خوش است بوے گل و باغِ مرغ گلزار خوش است
ابریشم زیر و تلّہ زار خوش است اے بے خبران این ہمہ بایار خوش است

☆☆☆

مجموعی عاشق

گویند مرد در پئے آن سرو بلند انگشت نماے غلق بودن تا چند
بے فائدہ چند مدہ اے دانشمند من چون نروم کہ مے بر دم بہ کند

خونبرگ

آہو برہ را کہ شیر در پے باشد بچارہ چہ اعتماد بروے باشد
این ملخ در آب چند بتواند بود وین برف در آفتاب تا کہ باشد

☆☆☆

توحید

آزرا کہ نظر بروئے ہر کس باشد در دیدہ صاحب نظران خس باشد
قاضی بہ دو شاہد بدہد فتویٰ شرع در مذہب عشق شاہدے بس باشد

☆☆☆

ریاضت کشان

مردان ہمہ عمر پارہ بر دوختہ اند قوتے بہزار حیلہ اندوختہ اند
فرداے قیامت بکناہ ایشان را باشد نہ سوزند کہ خود سوختہ اند

☆☆☆

مطابقہ

با دوست بگرمایہ درم خلوت بود وان روے گلنیش گلِ حمام آلود
گفتا دگر این روے کسے دارد دوست گفتم بگلِ آفتاب نتوان اندود

☆☆☆

غروبِ حسن

چون صورت خویشمن در آئینہ بدید وان کام و دہان و لب و دندان بگوید
میگفت چنانکہ میتوانست شنید بس جان بلب آمد کہ بدین لب نرسید

☆☆☆

انتظار

امشب نہ بیاضی روز بر می آید نہ نالہ مرغانِ سحر می آید
بیدار نشسته ام نظر بر سرِ کوه تا صبح کہ از سنگ بدر می آید

☆☆☆

فصل خزان

وقت ست کہ چشم فتنہ خوابش بہرد باد از رخ گل حسن شابش بہرد
گل وقت رسیدن آب عطار بہرد عطار بوقت رفتن آبش بہرد

☆☆☆

فصل بہار

وقت گل و روز شادمانی آمد ہنگام نشاط و کامرانی آمد
آن شد کہ بسرما نتوانی آمد سرما شد و وقت مہربانی آمد

☆☆☆

عظمت عاشق و معشوق

ما چاکر آنیم کہ دل بر باید یا دل بہ کس دہد کہ جان آساید
آنکس کہ نہ عاشق و نہ معشوق کس ست در ملک خدا اگر نباشد شاید

☆☆☆

بے ثباتی و زعم گانی

آن گل کہ ہنوز نو بدشت آمدہ بود نشکفتہ تمام، باد مہرش بر بود
بیچارہ بے امید در خاطر داشت امید دراز و عمر کوتاہ چہ سود

☆☆☆

حسرت

من دوش قضا یار و قدر پشتم بود نارنج ز نخدان تو در مشتم بود
دیدم کہ ہی گزم لب شیرینت بیدار چہ عشتم سر انگشتم بود

☆☆☆

صلح با دشمن قوی

چون خیل تو صد باشد و خصم تو ہزار خود را بہ ہلاک می سپاری ز نہار
تا بتوانی برآورد از خصم دمار چون جنگ ندانی آشتی عیب دمار

☆☆☆

ناگریز بودن معشوق

نامردم اگر زخم سر از مهر تو باز خواهی باشم بجز و خواهی بنواز
در بگریزم ز دست اے مایه ناز هر جا که روم پیش تو می آیم باز

☆☆☆

صدق طلب

تا سر نه کنم در سرت اے مایه ناز کوته نه کنم نه دامت دست نیاز
هر چند که راهم بتو دورست و دراز در راه بگرم و مگردم ز تو باز

☆☆☆

خو برویان را دوست داشتن

گر بے خبران و عیب گویان از پس منسوب کنندم بهواؤ بهوس
آخر نه گناه است که من کردم و پس منظور لایح - دوست دارد همه کس

☆☆☆

حفظ جان از مهالک

چون زهره شیران ببرد نعره کوس برباد ده جان گرامی به فسوس
با آنکه خصومت نتوان کرد بساز دست که بقوت نتوان برد بهوس

☆☆☆

معاشرت با دوست

یا بهجو هماره بر من آنگن پر خویش تا بندگیت کنم بجان و سر خویش
در لایق خدمت ندانی بر خویش گو من سر خویش گیرم و کشور خویش

☆☆☆

مسائلی نیکان و بدان

همسایه که میلی طبع باشد سولش فردوس برین بود سرا در کولش
وان را که نخواهی که به بنی رولش دوزخ باشد بهشت در پهلوش

☆☆☆

حسرت جوانی و پیری

ہر سرو قدے کہ بگورد در نظر مں
چون من توانم کہ جوان گروم باز
در ہیہات او خیرہ بماند بصر مں
آخر کم از آنکہ در جوانان مگر مں

☆☆☆

نخنی صدمہ فراق

خود را بمقام شیر مے دانستم
کفتم، من و صبر، اگر بود روز فراق
چون خصم آمد بہ روئے ما نستم
چون واقعہ افتاد نتوانستم

☆☆☆

تاسف بر عمر گزشتہ

شبہا ز ہمہ خلق نہان می گریم
طفل از غم مرغ رفتہ چون گریہ کند
چشم از غم دل بر آسمان می گریم
بر عمر گزشتہ ہچنان می گریم

☆☆☆

انتماح از خوردہ گیری

چون ما و شما اقارب یکدگریم
اے خوابہ تو عیب من مکن تا من نیز
بہ زان نبود کہ پردہ ہم ندریم
عیب تو نکویم کہ یک از یک ہمیریم

☆☆☆

خواہش جنگ بامید ممانعت

گر بر رگ جان زشت آید تیرم
دل با تو خصومت آرزو میکندم
چہ خوشتر از آنکہ پیش دست میرم
تا صلح کنی و در کثارت گیرم

☆☆☆

حضور دوست

می آئی و لطف و کرم می بینم
وان وقت کہ غائبی ہمت می بینم
و آسائش جان در قدمت می بینم
ہر جا کہ نگہ می کشم می بینم

☆☆☆

تجاشی از توبہ

گفتم کہ دگر چشم بہ دلبر نہ کنم صوفی شوم و گوش بہ منکر نہ کنم
دیدم کہ خلاف طبع موزون من است توبہ کردم کو توبہ دیگر نہ کنم

☆☆☆

دشواری مواصلت

مہ راز فلک بطرف بام آوردن و ز روم کلیسیا بشام آوردن
در وقت سحر نماز شام آوردن بتوان نتوان ترا بدام آوردن

☆☆☆

دلیل عدم وصولی الی اللہ

نہ سرو توان گفت نہ خورشید و نہ ماہ آہ از تو کہ در وصف نمی آئی آہ
ہر کس برہے میرود اندر طلبت گر رہہ بتو بودے نہ بدے انہمہ راہ

☆☆☆

سیر نعدن از دوست

اے راہ روان را گزر از کوئے تو نہ با پیخیز از عشق و گزر سوئے تو نہ
ہر تشنہ کہ از دست تو بستاند آب از دست تو سیر گردد از روئے تو نہ

☆☆☆

فراموش نکردن در نصیبت

اے یار کجائی کہ در آغوش نہ و امشب برمانشت چون دوش نہ
اے سرو بلند و راحت جسم و روان ہر چند کہ غائبی فراموش نہ

☆☆☆

شکایت از دیدہ و دل

اے کاج نکردے نگاہ از دیدہ بر دل نہ زدے عشق تو راہ از دیدہ
تقصیر ز دل بود گناہ از دیدہ آہ از دل و صد ہزار آہ از دیدہ

☆☆☆

طلب حمایت از دوست

روزے دو سه شد که بنده نواخته و اندیشه به ذکر ما نه پرداخته
زان می ترسم که دشمنان انده شد کز چشم عنایتم بینداخته

☆☆☆

دشواری ترک نظر

گفتم که کنم توبه ز صاحب نظری باشد که بلائے عشق گردد سپری
چندانکه نگه می کنم اے رهکِ پری بار دومین ز اولین خوب تری

☆☆☆

در بلای عظیم از اندک ضرر رسیدن

گویند که دوشِ شنگان تتری دزدے بگریختند بعد حیلے گری
امروز به آویختنش می بردند میگفت رہا کن که گریبان بدری

☆☆☆

عشق فطری

گیرم که به فتوای خردمندی وراے از دایره شرع بیرون عہم پائے
با میل که طبع می کند چه توان کرد بچے ست که درمن آفریده خدائے

☆☆☆

مفردات

فرزدان باخلف

دانی چه گفته اند بنی عوف در عرب
نسل بریده به کہ موالید بے ادب
ترک ماسوا

تو آتش به نے درزن و درگزر
کہ نہ خشک در بیشہ ماند نہ تر
زور آزمائی بر ضعفا

مروت نہ باشد بہ افتادہ زور
بزد مرغ دون دانہ از پیش مور
موافقت روزگار

خواہی کہ بہ طبع ہمہ کس دارد دوست
باہر کہہ در اوقتی چنان باش کہ اوست
محق ہدایت و ضلالت

گر راہ نمائی ہمہ عالم راہ است
در دست نہ گیری ہمہ عالم چاہ است
حوادث ناگہانی

نہالے کہ سی سال گردد درخت
ز بخش بر آرد یکے باد سخت
صحت ناجس

اگر نواب دسر ہنگام ہم از در گسہ رانند
از ان بہتر کہ در پہلوئے محبوب لاشائند
موافقت وقت

سلطان چو بہ منزل گدایان آید
گر بر سر بوریا نشیند شاید
شان ضعفا

گر ز ہفت آسمان گزند آید
ہمہ بر عفو دردمند آید

فرق در مشقت و مصیبت

اگر دندان نباشد نان توان خورد
مصیبت آن بود کت نان نباشد
خاصه گدایان

منعم که نظر بحال درویش کند
چندانکه کرم کند طمع بیش کند
اعتدال در تواضع

تواضع گر چه محمود است و فضل بیکران دارد
نشانید کرد بیش از حد که ہیبت رازیان دارد
دو گونه یاس بعد از امید

کفتم که برآید آبه از چاه امید
افسوس که دلو نیز در چاه افتاد
مسافر نوازی

بشکر آنکه تو در خانه و اہلت پیش
نظر در بلغ مدار از مسافر درویش
فرق در عاقل و نادان

کوہ نظران را نبود جز غم خویش
صاحب نظران را غم بیگانه و خویش
حمل

گر بلندت کسے دهد دشنام
بہ کہ ساکن دہی جواب سلام
نامح تجربہ کار

بشنو کہ من نصیحت پیران شنوده ام
بیش از تو خلق دیدہ و بیش از تو بودہ ام
دلداداری بر اصول آزادی

از بہر دل کسے بدست آوردن
مطبوع نباشد دگرے آزر دزن
جزائے

جو بد گفتی مہاش ایمن ز بدگو
کہ بد را کس نخواہد گفت نیکو
عالم مقلد

صاحب دل و نیک سیرت و علامہ
گو کفش دریدہ باش و خلقان جامہ
اعتدال در سقا

کرم بجائے فرو ماندگان جو بتوانی
مروت است نہ چندانکہ خود فرومانی

تفسیر مردانگی

مردی نہ بقوت است و شیرزنی
آنست کہ ظلمے کہ توانی نہ کنی
استقام دوتی

تو باما روز و شب در باغ آنی
خلاف است اینکه طول العہد بینی
ہدیہ ضعفا

پائے ملخے نزد سلیمان بردن
عیب است ولیکن ہنراست از مورے
صیحت ناشنودن

من سخن راست نوشتم تو اگر راست نخوانی
جرم الجلاج نباشد چو تو شطرنج ندانی
ختم کلام

کتبت لیبقی الذکر فی امم بعدی

فیما ذا الجلال اغفر لکاتبہ السعدی

مطابحات و ہزلیات و مضحکات

شیخ کی کلیات کا سب سے اخیر حصہ مجموعہ ہزلیات ہے جو تیس تیس صفحہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارض کمال پر ایک نہایت بدنامہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اُس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل متافی ہے۔ اس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے۔ حضرت نے اس حصہ میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالاے طاق رکھ کر خوب آزادی اور پیا کی سے دل کھول کر فحش اور ہزل کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ پوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اُس شخص کا ہے جس کے نتائج افکار سے گلستان اور بوستان جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا خطاوار اور ناقص ہونا یہی اُس کے انسان ہونے کی علامت ہے اور اُس کے اقوال و افعال کا تفاوت اور اختلاف اور اُن کا ہمیشہ ایک ضابطہ اور ایک قانون کے موافق سرزد نہ ہونا یہی وہ چیز ہے جو اُس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کے خیالات کو ایک نادان بچہ کی حرکتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری حرکت پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا اور جب یہ مفت حد سے گزر جاتی ہے تو اس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے۔ مگر شیخ نے اس مجموعہ کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت میں لکھی ہیں جو قابل لحاظ ہیں وہ لکھتا ہے کہ الزَمْنِي بَعْضُ اَنْبَاءِ الْمُلُوكِ اَنْ اَصَيْفَ لَهُ، كِتَابًا فِي الْهَزْلِ عَلَى طَرِيقِ السُّوَزْنِي فَلَمْ اُجِبْهُ فَهَذَا ذَنْبِي بِالْقَتْلِ فَلَا جُلَّ ذَلِكْ اَجِبْتُ اَمْرَهُ وَاَنْشَدْتُ هَذِهِ الْاَبْيَاتِ وَاَنَا اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الْعَظِيمَ۔ یعنی ایک بادشاہ زادہ نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ میں اُس کے لیے ایک کتاب حکیم سوزنی کی روش پر ہزل میں لکھوں۔ میں نے نہ مانا اس پر اُس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی۔ اس لیے ماننا پڑا اور یہ اشعار لکھے۔ اور

میں خدائے بزرگ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں۔

شیخ کا عذر جہاں تک ہماری رائے ناقص میں آتا ہے بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ شیخ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ہمیشہ سیر و سفر میں رہتا تھا۔ تاتار سے لے کر روم و مصر و حبش تک اُس کی جولان گاہ تھی اُس کی شاعری اور نکتہ سنجی کا شہرہ اُس کی زندگی ہی میں دور دور پہنچ گیا تھا۔ مسلمان امیر زادوں اور بادشاہوں کی صحبتوں میں لہو و لعب اور تسخر و استہزا کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ پس اگر کسی نالائق بادشاہ زادے نے شیخ کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا شہرہ سن کر اس خیال سے کہ ہمیشہ گرمی صحبت کے لیے ایک مجموعہ ہزل و فحش موجود رہے شیخ کو ان ہنوت کے لکھنے پر مجبور کیا ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ اور چونکہ اس مجموعہ میں صریح فحش اور علانیہ مہکلو کے سوا باہرا اور لطیف خیالات جیسے کہ شیخ کے کلام کی عام خاصیت ہے بہت کم پائے جاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ تمام ہزلیات دل کی اُچھ اور طبیعت کی اُمنگ سے نہیں بلکہ محض نفرت و کراہت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

ایران میں ہزل و فحش کی شاعری دورہ غزنویہ کے شعرا سے برابر چلی آتی تھی اور یہ طریقہ اس قدر عام اور بے عیب ہو گیا تھا کہ افاضل شعرا کی عظمت اور بزرگی میں اس سے کچھ فرق نہ آتا تھا۔ اکثر ہاجی اور ہزال حکیم کے لقب سے ملقب ہوتے تھے اور اب تک جیسے حکیم انوری، حکیم خاقانی، حکیم شافعی، حکیم قاضی وغیرہ وغیرہ۔ سوزنی بھی جو چھٹی صدی کا شاعر ہے اور جس کا ذکر شیخ کی مذکورہ بالا عبارت میں ہے حکیم سوزنی کہلاتا تھا۔ اس کا ہزل اور فحش انتہا درجے کو پہنچ گیا تھا۔ اس نے حکیم سنائی کی بہت سی ہجویں لکھی ہیں اور حکیم صاحب نے بھی باین ہمہ مشیخت و تقدس جنگ آ کر اُس کے جواب میں ایسی جامع و مانع گالی تصنیف فرمائی ہے جو سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھکڑ کا جواب ہو سکتی ہے۔ حکیم ابو اطلالی گنجوی جو منوچہر شروان شاہ کے عہد میں پایہ تخت کا ملک الشعرا تھا۔ باوجودیکہ وہ حکیم خاقانی کا مرئی اور خسر تھا اُس کے اور خاقانی کے باہم ایسی رکیک اور نالائق ہجو بازی ہوتی تھی جس کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو روائی سوسائٹی میں اس قدر عام اور بے عیب ہو جائے اُس سے بالکل پاک اور مہترار ہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اُس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے۔

ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے عنفوان شباب میں جو شوخی اور پیا کی کا زمانہ ہے کسی موقع پر یہ خرافات بھی لکھ دی ہوگی۔ اور ایسا کم و بیش ہر شخص سے ظہور میں آتا ہے۔ مگر کوئی شخص ایسے بیہودہ اور فحش کلام کو اپنی تصنیفات میں شامل کر کے اپنی طرف منسوب اور اپنے نام سے شائع نہیں کرنا چاہتا۔ شیخ نے بھی یقیناً ایسا ہرگز نہ چاہا ہوگا مگر چونکہ وہ زمرہ مشائخ و عرفا میں سے گنا جاتا تھا اور معتقدین کے نزدیک اُس کا ہزل بھی انوار و برکات سے خالی نہ تھا اس لیے کسی بزرگوار نے اُس کی وفات کے بعد اس ناشدنی مجموعہ کو بھی تبرکات و تہنات میں داخل کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ گلستان کے مرتب ہونے سے پہلے لکھا جا چکا تھا کیونکہ اس کے چند اشعار جن میں زیادہ ہزل نہیں ہے۔ شیخ نے گلستان میں اپنے اپنے موقع پر نقل کیے ہیں۔

ہم کو بہت تجسس سے چند رباعیاں اور قطعے اس مجموعہ میں ایسے ملے ہیں جو فحش سے پاک ہیں سو وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

رباعیات

انجام حسن نوخضان

آن عہد بیا داری و دولت و داد کز عاشق بیچارہ نئے کردی یاد
انکہ مگر بختی کہ کس چون تو نبود و امروز بیامدی کہ کس چون تو مباد

اینا

آن ماہ کہ گفتی ملک رحمان ست این بار اگرش نگہ کنی شیطان ست
روے کہ چو آتش بزمستان خوش بود امروز چو پوشتین بہ تابستان ست

قطعات

تقویٰ بحرورت

چو خوشن نواند کہ می خورد قاضی ضرورت ست کہ بردمیران بگیرد سخت
کہ گفت چہ زن از میوہ میکند پرہیز دروغ گفت کہ دستش نہیرسد بدو سخت

تاسف در بلائے عظیم بر قوت اندک

مرد کے غرقہ بود در جیحون کز سمرقند بود پندارم
 بانگ می کرد و زار می نالید کای درینا کلاه و دستارم

توبہ ضعف و پیری

حریف عمر بسر بردہ در فسوق و فجور بوقت مرگ پشیمان ہی خورد سوگند
 کہ توبہ کردم و دیگر گنہ نخواہم کرد تو خود دگر نتوانی بریش خویش جند

☆☆☆

عربی قصائد اور مقطعات

کلیاتِ شیعہ میں بیس صفحہ کے قریب قصیدے اور قطعے بھی شامل ہیں اور ان کے سوا اُس کے ملامتعات میں عربی اشعار اور مصرعے کثرت سے موجود ہیں۔ گلستان میں بھی جیسا کہ اُس نے خاتمہ میں تصریح کی ہے تقریباً تمام عربی اشعار اُسی کے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اُس کی عمر کا ایک بڑا حصہ دیارِ عرب میں بسر ہوا تھا اور عربی زبان بمنزلہ مادری زبان کے ہو گئی تھی اُس کے تمام فارسی اور عربی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیلِ علم کے بعد اُس نے زیادہ تر اپنی توجہ دینیات اور تصوف اور علمِ ادب میں مصروف کی تھی۔ گو اُس کا عربی کلام بہت تھوڑا ہے مگر جس قدر ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مشاق اور ماہرِ ادیب کا ہونا چاہیے بایں ہمہ وہ عربی شعر میں شاعری کا اذعان نہیں کرتا چنانچہ بغداد کے مرثیہ میں لکھتا ہے۔

وَبِالشَّعْرِ أَيْمُ اللَّهِ لَنْتُ بِمُدَّعٍ وَلَوْ كَانَ عِنْدِي مَا بِبَابِلَ مِنْ سِخْرِ	بخدا کہ میں شاعری کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اگرچہ میرے کلام میں وہ جادو موجود ہے جو بابل میں موجود تھا۔
هَذَا لَكَ نَقْأُذُونٌ عِلْمًا وَخُبْرَةً وَمُنْتَجِبُوا الْقَوْلَ الْجَمِيلَ مِنَ الْهَجْرِ	یہاں علم اور واقفیت کی رو سے پرکھنے والے اور عمدہ کلام کو بُرے کلام میں سے چھانٹنے والے موجود ہیں۔
جَسَرْتُ عَبْرَاتِي فَوْقَ خَدَيْكَ كَأَبَةٍ فَأَنْشَأْتُ هَذَا فِي قَضِيَّةٍ مَا يَنْجِرُنِي	سوزِ دل کے سبب میرے آنسو چہرہ پر ٹپک پڑے۔ سو میں نے یہ قصیدہ اس سرگذشت کے بیان میں لکھ لیا۔

وَلَوْ سَبَقْتَنِي مَسَادَةٌ جَلَّ قَدْرُهُمْ
لَمَّا حَسُنَتْ مِنِّي مَجَاوِزَةُ الْقَلْبِ
اگر ذی رتبہ لوگ اس مضمون میں مجھ
سے سبقت کرتے تو البتہ مجھ کو اپنے رتبہ
سے تجاوز کرنا زیادہ تھا۔

بہر حال اُس کا عربی کلام جس قدر ہے اور جیسا ہے غنیمت ہے اور اس سے شیخ کی
شاعری کا رتبہ سوایا بلکہ ڈیوڑھا ہو گیا ہے اب ہم اُس کے ایک طولانی قصیدہ میں سے جو کہ
اُس نے خرابی بغداد پر لکھا ہے کچھ اشعار بطور نمونہ کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

حَبَسْتُ بِجَفْنِي الْمَذَامِعَ لَا تَجْرِي
فَلَمَّا طَفَى الْمَاءُ انْطَالَ عَلَى السُّكْرِ
میں نے اپنی پلکوں میں آنسوؤں کو روک دیا
تھا کہ بہنے نہ پائیں پر جب پانی نے
طفیانی کی تو اُس بند کو توڑ ڈالا۔

نَسِيتُ صَبَا بَغْدَادَ بَعْدَ خَرَابِهَا
تَمَنَيْتُ لَوْ كَانَتْ ثَمَرُ عَلَى قَبْرِى
کاش ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد
اُس کی ہوا کا جھوکا میری قبر پر گزرتا۔
کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک مر جانا
تنگدل جینے سے بہتر ہے۔

أَحَبُّ لَهُمْ مِنْ عَيْشٍ مُقْبِضُ الصَّدْرِ
زَجَرْتُ طَبِيبًا حَشَّ نَبْضِي مَدَاوِيًا
میں نے طیب کو جب کہ اُس نے
علاج کے لیے میری نبض کو چھوا جھڑک
دیا کہ جا اپنا کام کر مجھ کو ایسے مرض کی
شکایت نہیں جو لہجہ ہو سکے۔

لَزِمْتُ اضْطِبَارًا حَيْثُ كُنْتُ مُفَارِقًا
وَهَذَا فِرَاقٌ لَا يُعَالِجُ بِالصُّبْرِ
میں نے ہمیشہ احباب کی جدائی میں صبر
اختیار کیا ہے مگر یہ ایسی جدائی ہے جس کا
علاج صبر سے ممکن نہیں۔

وَلَا تَسْأَلْنِ عَمَّا جَرَى يَوْمَ حَضْرِهِمْ
وَذَلِكَ مِمَّا لَيْسَ يَدْخُلُ فِي حَضْرِهِمْ
نہ پوچھو جو حال بنی عباس کی قید کے دن
گزر رہا یہ وہ حال ہے جو قید بیان میں
نہیں آ سکتا۔

شراب مرگ کے جام گردش میں لائے
گئے یہاں تک کہ قیدی کشتوں کے سر
تڑپتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے
گویا نشتے میں جنبش کر رہے ہیں۔

علمائے راسخین پر جو کہ اصحاب عقل و
دانش تھے مدرسہ مستنصریہ کی دیواریں
زار زار رو رہی ہیں۔

اُن کے بعد دواتیں اپنی سیاہی کے
آنسوؤں سے روتی ہیں مگر بعض لوگوں
کے دل دوات سے زیادہ سیاہ ہیں۔

یہ زمانہ کے سخت حادثے ہیں کاش میں
ان سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم
دانشمندوں پر بند دیکھتا۔

میں نے شہر عبادان میں ٹھہر کر دجلہ کے
پانی کو دیکھا کہ کتر خون کی مانند سمندر کی
طرف بہتا تھا۔

میرے آنسو جو شہر واسط کی مصیبت میں
جاری ہیں خلیج فارس کے مدوجز کو اور
بڑھادیے ہیں۔

فرض کرو کہ دار الخلافہ پھر آباد ہو اور علماء
کے چہرے غبارِ ذلت سے پاک کیے
جائیں۔

أَذِنَتْ كُؤُوسُ الْمَوْتِ حَتَّى كَانَتْ
رُءُوسَ الْأَسَارَى تَحْرُكُنْ مِنَ السُّكْرِ

بَكَتْ جُدُرُ الْمُسْتَنْصَرِيَّةِ نُهْبَةً
عَلَى الْعُلَمَاءِ الرَّاسِخِينَ ذَوِي الْجَنْبِ

مَحَابِرُ تَبَكَّى بَغْلَهُمْ بِسَوَادِهَا
وَبَعْضُ قُلُوبِ النَّاسِ أَمْلَكَ مِنْ جَنْبِ

نَوَائِبُ دَفَعِ لَيْثِي مِثْلَ قَبْلَهَا
وَلَمْ أَرْ عِلْدَوَانَ الشَّفِيفَةِ عَلَى الْجَنْبِ

وَقَفْتُ بِعَبَادَانَ أَزْقُبُ دِجْلَةً
كَمِثْلِ دَمٍ فَإِنْ تَسِيلُ إِلَى الْبَحْرِ

وَقَائِصُ قَمْعِي فِي مُصِيبَةِ وَاسِطِ
يَزِيدُ عَلَى مَدِّ الْبَحِيرَةِ وَالْجَزْرِ

وَهَبَ أَنْ دَارَ الْمُلْكِ تَرْجِعُ غَامِرًا
وَيُغْسَلُ وَجْهُ الْعَارِفِينَ عَنِ الْغَمْرِ

لیکن بنی عباس جن سے عالم کو فخر تھا جن کے اخلاق برگزیدہ اور پیشانیاں نورانی تھیں کہاں سے آئیں گے۔

ان کا ذکر دنیا میں ایک فسانہ ہو گیا اور یہ وہ افسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلودہ کرتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ دین محمدی پھر غریب ہونے والا ہے جیسا کہ ابتدا سے حال میں وہ غریب تھا۔

کیا وہ اس حالت سے بھی زیادہ غریب ہونے والا ہے کہ تمام دارالاسلام کفر کے آتے ہی غریب ہو گیا۔

کیا منبروں پر خطبہ پڑھا جائے گا اور مستعصم باللہ کا اُس میں ذکر نہ ہوگا۔

کیا اس پر صبر ہو سکتا ہے کہ مینڈک پانی کے ادھر ادھر خوشی سے کھیلتے پھریں اور یونس پانی کی تہ میں ہو۔

مشاق کا سلام اور ہزاروں رحمتیں اُن شہیدوں پر جو گناہوں سے پاک تھے۔

موت کا لالہ پالا اور جو کچھ کہ اُس میں خدا کی طرف سے اجر عظیم ہے اُن کو گوارا ہو جیو۔

فَإِنَّ بَنُو الْعَبَّاسِ مُفْتَخِرُ الزُّرَى
ذُووُ الْخُلُقِ الْمَرْحِيِّ وَالْفَرَرِ الزُّهْرِيِّ

عَدَا سَمَرًا بَيْنَ الْأَنَامِ حَدِيثُهُمْ
وَدَاسَمُرٌ يَذْمِي الْمَسَامِعَ كَالسُّمْرِ

وَفِي النَّجَبِ الْمَرْزُوقِ دِينِ مُحَمَّدٍ
يَعُودُ غَرِيبًا قَبْلَ مُبْتَدَا الْأَمْرِ

ءَاغْرَبُ مِنْ هَذَا يَعُودُ كَمَا بَدَا
وَسَبَى دَارُ السَّلَامِ فِي بَدَا الْكُفْرِ

أَتَذْكُرُنِي أَعْلَى الْمَنَابِرِ خُطْبَةً
وَمُسْتَعْصِمٌ بِاللَّهِ لَمْ يَكُ فِي الذِّخْرِ

ضَفَادُ حَوْلِ الْمَاءِ تَلْعَبُ فَرَحَةً
أَصْبَرُ عَلَى هَذَا وَيُونُسُ فِي الْقَفْرِ

تَحِيَّةٌ مُشْتَقِي وَأَلْفُ تَرْحِمٍ
عَلَى الشُّهَدَاءِ الطَّاهِرِينَ مِنَ الْوُزْرِ

هَيْنًا لَهُمْ كَمَاسُ الْمَيِّتَةِ مُتْرَعًا
وَمَا فِيهِ عِنْدَ اللَّهِ مِنْ عَظَمِ الْأَجْرِ

ہمیشہ اُن پر شام سے صبح تک زور کی قفل
گاہ میں خدا کی رحمت نازل رہیو۔

کاش ایسا ہوتا کہ قید میں محلوں کے بے
پردہ ہونے کی خبر سننے سے پہلے میرے
کان بہرے ہو جاتے

قید کی صبح گویا قیامت کا دن تھا کہ اُمّتیں
سر میں خاک ڈالے ہوئے میدان حشر
کی طرف ہکائی جاتی تھیں۔

بہت لوگ فریاد کرتے تھے کہ دُہائی ہے
مروت کی کوئی مدد کرو۔ مگر باز کے پنے
میں چڑیا کی فریاد کو کون پہنچتا ہے۔

جو لوگ زجر اور دھمکی سننے کی عادی نہ
تھے اُن کے حرم محترم صحرائیں بکریوں کی
طرح ہکائے جاتے تھے۔

جو لڑکیاں پردہ میں چادروں سے
چہرے باہر نہ نکالتی تھیں اُن کے کھلے
منہ اسیر کر کے لے گئے۔

وہ کھڑی ہوتی ہیں اور چادروں اور
ٹیلوں کے ڈھلانون میں منہ چھپاتی
ہیں مگر اُن کٹھن رستوں میں نازنینوں کی
چال کب چھپ سکتی ہے۔

اس سے پہلے میری فکر جیسی تھی تو جانتا
ہے مگر ایک ایسا امر عظیم حادث ہوا جو
میرے فکر کے احاطہ سے باہر ہے۔

عَلَيْهِمْ سَلَامُ اللّٰهِ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ
بِمَقْتَلِ زَوْرَاءِ اِلٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ
وَلَيْتَ صُمَاخِي صُمَّ قَبْلَ اِسْتِمَاعِهِ
بِهَتْكَ اَسَاتِيرِ الْمَحَارِمِ فِي الْاَسْرِ

كَأَنَّ صَبَاحَ الْاَسْرِ يَوْمٌ قِيَامَةٍ
عَلَى اُمَمٍ شُعْبُتْ نَسَاقِ اِلَى الْحَشْرِ

وَمُسْتَضْرِحٌ بِالْمُرُوءَةِ فَانْضُرُوا
وَمَنْ يُضْرَحِ الْغُصْفُورَ بَيْنَ يَدَيِ صَفَرٍ

يُسَاقُونَ سَوْقَ الْمَغْرِ فِي كَيْدِ الْفَلَا
عَزَّ اَنْزَقَوْمٌ لَا يَعْوِذُونَ بِالزَّجْرِ

جُلَيْنَ سَبَا سَافِرَاتٍ وَجُوْهَهَا
كَوَاعِبُ لَا تَبْرُزْنَ مِنْ حُلْلِ الْخُلْبَرِ

تَقْزُومُ وَتُخْفُوا فِي الْمَعَاجِرِ وَاللَّوَى
وَهَلْ يَخْفَى مَشَى النَّوَاعِمِ فِي الْوَعْرِ

لَقَدْ كَانَ فِكْرِي قَبْلَ ذَلِكَ مَا تَرَى
فَاُخِذْتُ اَمْرًا لَا يُحِيطُ بِهِ فِكْرِي

زمانہ کی گردش اور حکومت کے سامنے
شہنشاہوں اور داناؤں کے ہاتھ
بندھے ہوئے ہیں۔

خدا کی پناہ ہے فتنہ کی اُس آگ سے جو
دنیا کی ایک جانب سے دوسری جانب
تک بھڑکتی چلی گئی۔

خراسان سے ایک غبار نمودار ہو کر بلند
ہوا اور ایک گھنگھور گھٹائیں گئی جو چاند پر
سے بیٹنے والی نہ تھی۔

خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو دولت
بنی عباس کے بعد خواب غفلت سے
بیدار ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو
کے لیے تازیانہ ہے۔

خدائے بے نیاز و یگانہ کے ملک کے سوا
ہر ملک اور سلطنت کے پیچھے اُس کا
زوال لگا ہوا ہے۔

جب کہ مرنے کے بعد ہم سب میں
کچھ فرق نہ رہے گا تو لوگوں کو تکبر کی
نگاہ سے مت دیکھ۔

کتے کی طرح معشوقہ دنیا کی ہتھیلیاں
تو نرم نرم اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن
اُس کے ناخن تیز ہیں۔

وَبَيْنَ يَدَيَّ صَرْفِ الزَّمَانِ وَحُكْمِهِ
مُغْلَلَةٌ أَيْدِي الْقِيَاصِرِ وَالْجَنَاحِ

نُعُوذُ بِعَفْوِ اللَّهِ مِنْ نَارِ فِتْنَةٍ
تَاجِعُ مِنْ قُطْرِ الْبِلَادِ إِلَى الْقُطْرِ

بَذَا وَتَعَالَى مِنْ خُرَاسَانَ قَسَطُلُ
فَعَادُ رُكَّامًا لَا يَزُولُ عَنِ الْبَدْرِ

رَعَى اللَّهُ إِنْسَانًا يَتَّقُ بَعْدَهُمْ
لَأَنَّ مُصَابَ الزَّيْدِ مُزْجَرَةُ الْعَمْرِ

وَسَائِرُ مُلْكٍ يَفْتَنِيهِ زَوَالُهُ
سَوَى مُلْكُوتِ الْقَائِمِ الصَّمِدِ الْوَتَرِ

إِذَا كَانَ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا فَرْقَ بَيْنَنَا
فَلَا تَنْظُرَنَّ النَّاسَ بِالنَّظَرِ الشَّرِّ

وَجَارِيَةِ اللَّئِيَّا نَعُومَةً كَفَّهَا
مُخَسِّنَةً لِكِنَّهَا الْكَلْبُ ذُو الظُّفْرِ

اگر مال و دولت والا موت سے خالی ہوتا
تو البتہ بڑائی اور تکبر کرنے کا مستحق تھا۔
اگر تو نے نیک عمل کیے تو ہدایت کا نفع
اٹھالیا ورنہ کچھ شک نہیں کہ تو ٹوٹنے
میں رہا۔

مرنے کے بعد بہت سا مال چھوڑ جانا
آدمی کے لیے نیک کی بات ہے مگر اے
غافل تو اُلٹا فخر کے لیے مال جمع کرتا
ہے۔

خدا تعالیٰ ہماری گزشتہ خطائیں معاف
فرمائے اور ہمارے عیب بالکل چھپا کر
ہم پر احسان کرے۔

وَلَوْ أَنَّ ذَمَّالٍ مِنَ الْمَوْتِ خَالِيًا
لَكَانَ جَدِيرًا بِالتَّعَاطُفِ وَالْكَفْرِ
رُبِحْتَ الْهُدَىٰ إِنْ كُنْتَ عَامِلَ صَالِحٍ
وَإِنْ لَمْ تَكُنْ وَالْفَضْرِ إِنَّكَ لَفِي خُسْرٍ
عَلَى الْمَرْءِ عَارُ كَثْرَةِ الْمَالِ بَعْدَهُ
وَإِنَّكَ يَا مَغْرُورٌ تَجْمَعُ لِلْفَخْرِ

عَفَا اللَّهُ عَنَّا مَا مَضَىٰ مِنْ جَرِيْمَةٍ
وَمَنْ عَلَيْنَا بِالْجَمِيلِ مِنَ السُّتْرِ

خاتمہ

شیخ کے عام حالات اور اُس کی عام شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اُس کے قوی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس کے قریب عمر پائی۔

اُس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہل سلوک نفس شکنی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں اُس نے بھی بیت المقدس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مدت تک سقائی کی تھی۔

اُس کا مذہب جیسا کہ خود اُس کے کلام سے ظاہر ہے تسنن معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح اکثر صوفیہ کی نسبت تشیع کا گمان کیا گیا ہے اُس کو بھی قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المؤمنین میں شیعہ لکھا ہے۔ ہم اُس کے کسی خاص مذہب کا ثبوت دے کر ایک ایسے شخص کو جو مقبول فریقین ہے ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے تعصب تھا اور یہی اُس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے۔

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے اُس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اُس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف ایک نہایت بے تکلف، کھلا ڈالا، یار باش، ہنسوز، ظریف، ریا اور نمائش سے دور سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بے تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں

جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اُس نے مثل ظہیر، رشید، خاقانی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مداحی اور امیروں کی بھٹی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ بایں ہمہ وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے اُس کی کچھ نذر کرتا تھا وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے قصیدے ایسے ہیں جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جاسکتا ہے۔ امیروں سے وہ اس لیے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اُس کی سفارش سے جیسا کہ گلستان کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے۔ خودداری اور غیرت اُس میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا جیسا کہ اسکندریہ کے قحط میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدا تعالیٰ نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی اُس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں ایک جو ہر فطری دوسرے زمانہ کے ایسے اتفاقات جو اُس کے جلا کا باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اُسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مردم خیز خطہ تھا جہاں ہونہار بچوں کو خود بخود کسب کمال کی ترغیب ہونی چاہیے۔ یتیمی اور بے پردی اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بیکسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رشد کا باعث ہوئی ہیں۔ جس مدرسہ میں وہ حسن اتفاق سے تحصیل کے لیے پہنچا۔ وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سربراہ آورہ تھا اور جس دارالخلافت میں وہ مدرسہ واقع تھا وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شایعہ اور مہذب تھی۔ اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا بلکہ زمانہ نے بھی اُس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی۔ اُس کی عمر کا ایک

بہت بڑا اور مفید حصہ نہایت کٹھن اور دور دراز سفر کرنے اور دنیا کی عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات، ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دل سوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے ایکبار جیسا کہ گلستان میں مذکور ہے شام میں اُس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور دوستائی زادے وزارت کے درجہ کو پہنچ گئے۔ ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے اکیانوے برس بسر کیے تھے عجیب و غریب تماشے اس کی نظر سے گزر گئے۔ سلاطین کردیہ کا خاندان جن کی سعادت و جلالت، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی اُسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجھ، تونیہ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضطرب کر دیا۔ اسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت بحیرہ خزر اور جھیل یورال سے دریائے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی اسی صدی میں تاتاریوں¹ کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اسی صدی میں ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہوئی اور بقول بعض مورخین کے اُنھ لاکھ مسلمانوں کا خون مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستان اور بوستان میں ہے اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب و صاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بک گئی اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا۔ اسی صدی میں واقع ہوئے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا دارالملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا اسی صدی میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا۔ فرقہ اسماعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور و شور کے ساتھ حکمران رہا ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور گردوں نے شام میں ہمیشہ کے لیے اسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقایع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی

1۔ اس معرکہ میں جیسا کہ شیخ نجم الدین دایہ نے مرصاد العباد کے دیباچہ میں لکھا ہے تاتاریوں نے صرف رے اور اُس کے گرد و نواح میں تقریباً سات لاکھ مسلمان قتل اور اسیر کیے تھے اور خراسان کے چار شہر بلخ، مرو، ہرات اور نیشاپور بالکل تاراج اور نابود ہو گئے اور اُن کے دائیں بائیں اکثر بستیاں قتل و غارت کا نشانہ ہوئیں۔

بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے اُس میں کہتا ہے۔

رَعَى اللّٰهُ اِنْسَانًا تَبَقَّظَ بَعْدَ هُمْ لَآنَ مُصَابِ الزَّيْدِ مُزَجَّرَةً الْعَمْرُو
یعنی: خدا حمایت کرے اس شخص کی جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ
ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے۔ یورپ کے مشہور
مصنف ہبک صاحب کا قول ہے کہ میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی
مدرسہ روزگار میں پائی ہے جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور
دل سوز استاد تھے۔

اس کے سوا جیسی عمدہ صحبتیں شیخ کو میسر آئی تھیں ویسی بہت کم آدمیوں کو میسر آتی ہیں۔
شیخ کی عادت جیسا کہ ایک رسالہ¹ میں اُس کے فحوائے بیان سے معلوم ہوتا ہے یہ تھی کہ عالم
سفر میں وہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علماء، صلحا، مشائخ اور کالمین سے ضرور ملتا تھا۔ صاحب
نجات الانس نے لکھا ہے کہ شیخ نے کثرت سے دانشمندیوں اور عالموں کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی
بوستان میں لکھتا ہے۔

تمتع ز ہر گوشہ یافتم ز ہر خرمنے خوشہ یافتم

اگرچہ ساتویں صدی ہجری میں جس میں کہ شیخ کی جوانی اور بڑھاپا گزرا تھا مسلمانوں
کی علمی ترقیات اور فضائل و کمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی
بلاد اسلام میں ایک جم غفیر اعلیٰ درجے کے مشائخ اور علماء و حکماء کا نظر آتا تھا۔ خصوصاً جن ملکوں
میں شیخ کی زیادہ آمد و رفت رہی ہے جیسے ایران، روم، شام، عراق، عرب اور مصر وغیرہ وہ
اب بھی دینی اور دنیوی علوم کے مرکز تھے ہمارے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ملکوں
میں جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات
پائی ہے اور جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا اُن میں کم سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقق ایسے
موجود تھے جو تمام بلاد اسلام میں مانے گئے ہیں اور جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں
نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں۔ جیسے شیخ محی الدین ابن العربی، خواجہ نصیر الدین

طوسی، شیخ صدرالدین قونوی، مولانا جلال الدین رومی، ابن تیمیہ حرانی، امام یافعی، شیخ ابوالحسن شاذلی، شیخ تاج الدین قسطلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ابن قارض، شیخ اودھ الدین کرمانی، قاضی ابن خلکان شیخ الاسلام تقی الدین ابن الصلاح، خولجہ علاء الدین سمنانی، علامہ قطب الدین شیرازی، امام محی الدین نووی، قاضی ناصر الدین بیضاوی ابن عساکر فقیہ شافعی وغیرہ وغیرہ ایسے ایسے سینکڑوں جلیل القدر علماء اور مشائخ شیخ کی نظر سے گزرے تھے اور ان کے علاوہ جیسا کہ گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتا ہے وہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور ان کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتا تھا جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا۔ اسی طرح امرا کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتا تھا اور کبھی وہ احرار اور ابرار کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا اور کبھی اوباش والو اط کے جلسوں کا تماشا شائی تھا۔ نہ اُس کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا نہ بت خانے میں رہنے سے ننگ تھا۔ اسی نے جامع بعلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا اور وہی بت خانہ سومنات میں ایک مدت تک پجاری رہا۔ کبھی وہ بصرہ کے نخلستان میں یاروں کے ساتھ کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پیاسوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا۔ غرض کہ اُس کی تمام عمر فضائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعہ میں بسر ہوئی تھی۔ اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اسکو گریٹ مورلسٹ کہا ہے اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھینچ سکی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعراے ایران میں جس قدر عمر شیخ نے پائی ہے ظاہر اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے اس نے ایک سو بیس (120) برس اس نفس عنصری میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ ہر علم و فن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ عمر پانی ضرور ہے۔ مگر شاعر کے لیے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے۔ شاعر جس قدر بڑھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے اگرچہ شیخوخت کے مرتبہ کو پہنچ کر شاعر کے فکر میں بلند پروازی نہیں رہتی۔ لیکن بلاغت جو شاعری کا رکن اعظم ہے کمال کو پہنچتی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر پائی ہے گو کہ اُن کی قابلیت و استعداد اعلیٰ درجہ کی تھی مگر اُن کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا۔ جیسا کہ عربی شیرازی کی نسبت

شیخ ابو الفضل نے لکھا ہے ”غنیۃ استعدادش ناگفتہ ماند“ ایک نوجوان شاعر جس کی طبیعت میں کمال جودت اور بلند پروازی ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شوخ چالاک اُلھو پچھرا جس کی بھاگ دوڑ اور جست و خیز اکثر بے اصول اور خلافِ قاعدہ ہوتی ہے اور ایک معمر سن رسیدہ شاعر کو اُس کی فکر کیسی ہی پست اور محدود ہو اُس شایستہ اور سدھ مٹی گھوڑے کے مانند ہے جو کبھی بے اصول قدم نہیں اٹھاتا، الغرض شاعری کے لیے جتنی ضروری شرائط درکار ہیں وہ سب خداے تعالیٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں۔

شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت و واقعہ پر نہ کہ کھنکھناتے خیالات پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاثیر نہ ہوگی۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عام خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور نزاکت اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات چیت میں اور شعر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کیے جائیں۔ کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے تو دائرۂ شاعری سے خارج ہوگا۔ چوتھے شاعر کے دل میں جب کہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے کم و بیش اُس مضمون کا جوش اور ولولہ موجود ہونا چاہیے۔ ورنہ شعر نہایت کمزور ہوگا جیسے چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پوری پوری پائی جاتی ہیں ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیں گی۔ اگرچہ بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیتیں موجود ہیں لیکن اُن کا کلام چونکہ نہایت محدود اور ایک خاص صنف میں منحصر ہے جیسے خواجہ حافظ شیرازی غزل۔ اس لیے ہم اُن کو شیخ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔

شیخ کو اور شعرا پر اس سبب سے بہت بڑی فوقیت ہے کہ اس کی نظم و نثر دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلم الثبوت شعرا گزرے ہیں اُن میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے تسلیم کیا ہو۔ اگرچہ ہندستان میں نور الدین ظہوری کو بھی نظم و نثر کا جامع مانتے ہیں لیکن اہل ایران اُس کی نظم و نثر دونوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ بیشک اُس کی سہ نثر کے اکثر فقرے بادی النظر میں نہایت دل فریب ہیں جیسے۔

سنبُلِ خُرش از آہِ ناخکِ بیان بنفشہ نقطہ اش از خالیِ دلفریبان

”از شیخ طراوت کلمات نہر سطر مالال آب حیات خضر تشنہ لب سیرابی ادا مسجا
مردہ جان بخشی ہوا نکتہ ہائے برجستہ غنچہ ہائے سربستہ۔ نثرش نثرہ رفعت۔
شعرش شعری مرتبت ہر صفحہ جمنے و ہر سطرے نخلے برگش لفظ دلکش و بارش معنی
بے غش ہر حرفش فصلے و ہر فرعش اصلے“ اسی طرح سے نثر کے اور بہت سے
نقیرے الفاظ پرستوں کو نہایت خوشنما معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں الفاظ کے
سوا اور کچھ بھی نہیں۔

خوب اند و خوش اند و بوند ارند

بخلاف اس کے شیخ نے گلستان میں اس سے بہت زیادہ دلاویز و دلکش الفاظ میں
حقائق و اقصیہ کو بیان کیا ہے یہ بات گلستان کے سوا کسی فارسی نثر میں آج تک نہیں دیکھی گئی۔
مثلاً ”در ایام جوانی چنانکہ اقتد و دانی، نظرے داشتہ بہ رودے و گزرے داشتہ بہ کوے،
(2) اے برادر حرم در پیش و حرامیان از پس اگر رفتی بردی و اگر خشتی مردی (3) آزدن دلی
دوستان جہل ست و کفارہ یمین سہل (4) تو کہ چراغ نہ بینی پیراغ چہ بینی (5) طریق
درویشان ذکر ست و شکر و خدمت و طاعت و ایثار و قناعت و توحید و توکل و تسلیم و تحمل۔ ہر کہ
بدین صفہا موصوف است بحقیقت درویش ست۔ اگر چہ در قبا است۔ اما ہرزہ گردے
بے نمازے ہوا پرستے ہوس بازے کہ روز ہا بہ شب آرد در بند شہوت و شبہا روز کند در خواب
غفلت و بخورد ہر چہ در میان آید و بگوید انچہ بر زبان آید زندیق ست اگر چہ در عبادت
(6) پدر را غسل بسیار است اما پسر گرمی دار ست (7) صیاد بے روزی در درجلہ مائی نگیرد و
مائی بے اجل بر خشکی نمیرد (8) گوئی خردہ مینا بر خاکش ریختہ و عقد ثریا از تاش در آویختہ
(9) عصارہ تاکے بقدر تلش شہد فائق شدہ و تخم خرما بہ یمن تر بیتش نخل باسق گشتہ۔“

نظم و نثر کے جامع فارسی زبان ہی میں نادر الوجود نہیں ہیں بلکہ ہر زبان میں یہی حال
ہے انگریزی میں باوجودیکہ لٹریچر کی ترقی انتہا کے درجے کو پہنچ گئی ہے صرف کتنی کے آدمی
ایسے ہیں جن کو نظم اور نثر دونوں میں تمام اہل فن کے نزدیک قبولیت حاصل ہوئی ہے بعضے ملٹن
کو اور بعضے مسکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدھ آدمی کو نظم و نثر کا جامع خیال کرتے ہیں، پس شیخ
کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ ایران میں صرف اُسی کی نظم و نثر ایسی ہیں جن کو تمام

اہل زبان نے تسلیم کیا ہے۔

شیخ نے بھی تعزول یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعراے ایران کی طرح امردوں اور سادہ رخنوں کے عشق ہی پر رکھی ہے۔ لیکن یہ بات جیسی کہ بادی النظر میں مذموم اور قبیح معلوم ہوتی ہے حقیقت میں ایسی نہیں ہے اور صرف اسی بنا پر شیخ یا ایران کے اور شعرا پر امرد پرستی کا الزام لگانا بیجا ہے۔ فارسی زبان میں اور اُس کی پیروی سے اُردو زبان میں بھی ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت، رند ہو یا صوفی، خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا۔ مرد کا عاشق ہو یا عورت کا بلکہ سرے سے عاشق ہو یا نہ ہو ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اُس کا معشوق دونوں مرد ہیں۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت۔ دنیا دار ہو یا تارک دنیا، عشق حقیقی رکھتا ہو یا عشق مجازی، مرد کا عاشق ہو یا عورت کا ہمیشہ عاشقانہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ شاعر عورت ہے اور اُس کا معشوق مرد ہے۔ اس طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اُس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد کہیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑے گا۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی کی غزلوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ رُخ لڑکے پر مفتون ہیں اور اُن کے ہندی دوہروں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے اور عربی قصائد کی تشبیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطرب و بیقرار ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو حقیقت واقعی سے کچھ علاقہ نہیں ہے جس طرح ہزاروں پارسا اور پرہیزگار شاعر جنہوں نے نہ کبھی شراب کا مزا چکھنا نہ اُس کی صورت دیکھی نہ اُس کی بو سونکھی صد ہا شعر شراب و کباب کے مضمون کے لکھتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں پاکباز اور صاحب عقبت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو امرد پرست اور شاہد باز بن جاتے ہیں۔ البتہ اس سے مشرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے۔ جس کے اصول اور فروع سب قلع اور ہٹاؤٹ اور ادعا عانے محض پر مبنی ہیں۔ لیکن شیخ سعدی اور مولانا روم اور امیر خسرو

اور خواجہ حافظ اور تمام شعرائے متصوفین اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ اکثر عشق مجازی کے پیرایہ میں اپنے واردات اور حالات اور حقائق واقعہ بیان کرتے ہیں۔ بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے کلام کو جس میں بظاہر تمام خال و خط اور شراب و شہادہ کے مضامین درج ہیں حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اس سے شہادہ حقیقی کے شیون و صفات مراد لینی صرف ایک ملایا نہ گھڑت ہے جس میں سراسر تکلف اور بناوٹ پائی جاتی ہے۔ مگر ایسا خیال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کوچہ شاعری سے نا بلد ہیں۔ کنا یہ ہمیشہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور دوست کا ذکر ہمیشہ اغیار سے چھپایا جاتا ہے چنانچہ حضرت مولانا روم مثنوی میں صاف صاف فرماتے ہیں۔

خوشر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیث دیگران

شعرائے متصوفین کے اشعار اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کیے جائیں تو اُن میں وہ کرشمہ جس نے ایک عالم کے دل کو تسخیر کیا ہے باقی نہیں رہتا۔ نجات الانس میں لکھا ہے کہ مولانا محمد شیریں جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوان غزلیات متصوفانہ اشعار میں مشہور ہے اُن کے سامنے کسی نے اُن کے معاصر شیخ کمال السلیل خجندی کا یہ مطلع پڑھا۔

چشم اگر این است ابرو این و ناز و عشوہ این الوداع اے زہد و تقویٰ الفراق اے عقل و دین

مولانا نے سن کر کہا ایسا شعر کہنا کیا ضروری ہے جو معنی مجازی کے سوا کوئی اور محل نہ رکھتا ہو۔ شیخ نے بھی یہ بات سنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھیڑ کر کہا کہ چشم اور عین مراد لفظ ہیں پس عین سے ذات الہی مراد لی جاسکتی ہے اور ابرو حاجب کا مرادف ہے پس ممکن ہے کہ حاجب سے صفات الہی جو کہ حاجب ذات میں مراد لی جائیں۔ مولانا نے اس توجیہ کو تسلیم کیا اور شیخ کے بیان کی داد دی خواجہ حافظ کی نسبت اُسی کتاب میں لکھا ہے کہ ”یہ شخص لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے اُس نے اکثر اسرار غیبی اور معانی حقیقی مجاز کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کیے ہیں کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہو سکا“ پھر اکابر صوفیہ میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو کہ صوفیہ کے حق میں دیوانہ حافظ کو تمام دیوانوں سے بہتر بتاتے تھے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تغزل کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی شیرازی کے تتبع

سے حاصل کیا ہے۔

البتہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے تغزل کی بنیاد امرد پرستی پر کیوں رکھی ہے۔ عرب کی شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت اور ہندی میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہیں اور یہ دونوں طریقے نیچر کے مطابق ہیں۔ مگر مرد کا مرد پر عاشق و فریفتہ ہونا اور اُس سے وصل کا طالب اور کا مجو ہونا اگرچہ محض زبانی جمع خرچ کیوں نہ ہو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے فطرت انسانی بالکل ابا کرتی ہے ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کا تفرق نہیں ہے۔ اس میں ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی ہیں۔ پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعرا اپنے تئیں عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں لیکن اس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضامراً یا افعال وغیرہ سے ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت۔ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ فارسی میں عاشق و معشوق دونوں مرد فرض کیے جاتے ہیں۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی توجیہ ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ تھوڑا ہی سا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ جب مسلمان عرب سے نکل کر اطراف و جوانب میں پھیلے تو بسبب اس کے کہ ان کے ہاں عورتوں کا مردوں سے چھپانا مذہبی فرائض میں سے تھا غیر قوموں کے میل جول سے عورتوں کے باب میں اُن کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً مسلمان بادشاہوں میں اس غیرت کا ظہور سب طبقوں سے زیادہ تھا۔ ڈاکٹر برنیر فرانسسی جو ہندوستان میں پندرہ سولہ برس عالمگیر کے ساتھ رہا اپنے وقائع میں لکھتا ہے ”ہندوستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو بیگمات کی سواری کے نزدیک کوئی تنفس اگرچہ کیسا ہی ذی رتبہ اور صاحب اختیار ہو نہیں جانے پاتا تھا ورنہ بالضرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ہاتھ سے نہایت بے رحمی کے ساتھ پٹتا تھا اور ایران میں سنا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیگمات کی سواری سے آدھے فرسنگ کے فاصلے پر نظر پڑ جاتا تھا تو اُس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی اور جس شہر یا گانوں میں سے بیگمات کی سواری نکلتی تھی وہاں کے تمام مرد اور عورت اپنے اپنے مقام اور مسکن چھوڑ کر چلے جاتے تھے“ شاید اس بیان

میں کچھ مبالغہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاہوں کی غیرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ چونکہ شعرا اکثر بادشاہوں کے مداح اور مصاحب ہوتے تھے اس لیے وہ کوئی بات سلاطین کے مقتضائے مزاج کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے۔ پس نہایت قوی گمان ہے کہ شعرا نے غزل اور تشبیب میں عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر اور جو جو معاملات عشق کے زمانہ میں عاشق و معشوق کے درمیان واقع ہوتے ہیں اُن کو صاف صاف بیان کرنا سلاطین کی حمیت اور غیرت کے برخلاف سمجھا ہوا اور اس لیے تمام عشقیہ مضامین اُمردوں اور سادہ رُخوں پر ڈھالے گئے ہوں۔ سلاطین مغلیہ میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گزرا ہے وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر جہانگیر کے روبرو قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی غزل گارہا تھا اور بادشاہ اُس کو سن کر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ جب قوال نے یہ شعر گایا۔

تو شبانہ می نمائی بہ برکہ یودی اشب کہ ہنوز چشم مست اثرِ خمار دارد
بادشاہ دفعتاً بگڑ گیا اور قوال کو فوراً پٹوا کر نکلوا دیا اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور فوراً ملا نقشی مہر کن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا تھا بلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے مزاج کو دھیمہ کریں۔ جب وہ سامنے آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا پایا۔ عرض کیا حضور خیر باشد۔ بادشاہ نے کہا دیکھو امیر خسرو نے کیسی بے عزتی کا مضمون شعر میں باندھا ہے۔ بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا ہے؟ ملا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اُسی وقت بادشاہ کا غصہ فرو کر دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندستان میں نشوونما پایا تھا اس لیے وہ اکثر ہندستان کے اصول کے موافق اشعار کہتے تھے یہ شعر بھی اُنھوں نے اُسی طریقہ پر کہا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ تو رات کو کسی غیر عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشہ یا نیند کا خمار پایا جاتا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا۔ اور پھر گانا بجانا ہونے لگا۔

اگرچہ شیخ یا اور شعرائے ایران کے عاشقانہ اشعار سے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اُن کی اُمرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ گلستان کے

پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبت اُس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ کسی وقت میں اُس کو سادہ رُخوں اور امردوں کی طرف میلان خاطر رہا ہے۔ مگر اس بات کو میں کسی بُرے معنی پر محمول نہیں کرتا۔ صوفیہ کے حالات جو تمحّات وغیرہ میں لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو سالک کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقی باطنی کا ہے اور اکثر بڑے بڑے مشائخ اور عرفاء میں یہ خصلت پاکدامنی اور عفت کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔ شیخ نے جس طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا جا بجا اقرار کیا ہے اُسی طرح ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس سے بیسیوں جگہ اپنی براءت بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ غزل میں کہتا ہے۔

گر نظر صدق را نام گنہ می نہند حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

تمت بالخیر

